سلسلہ مطبوعات عصمت نمبر

عروسِ مشرق

تصنیف

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ

رازق الخیری ایڈیٹر عصمت و بنات نے

عصمت بک ایجنسی دہلی سے شائع کیا

پہلی مرتبہ

اگست ۱۹۳۶

عروسِ مشرق

اس نازک دور میں جب مغربی طوفان چمنستانِ مشرق کو پامال کر رہا ہے اور یورپ کی اندھا دھند تقلید ان خوبیوں کو مٹا رہی ہے جو ہندوستان کے لئے مایۂ ناز تھیں حضرت علامہ راشد الخیری کے لٹریچر نے قوم بدبخت کی آنکھیں کھول دیں اور یہ احساس پیدا کر دیا کہ دُور کے ڈھول سہاونے، جس رسیلی آواز پر ہندوستانی لٹو ہو رہے ہیں وہ اس قدر سخت اور کرخت ہے کہ کانوں کے پردے پھاڑ دے گی، اپنے بیش بہا جواہرات گنوا کر جو چمکتے ہوئے ہیرے سمجھے جا رہے ہیں وہ شیشے کے ٹکڑے اور جنہیں سونا خیال کیا جا رہا ہے وہ چمکیلے پیتل سے زیادہ نہیں حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ چوتھائی صدی میں اگر حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ مغربی سیلاب کو روکنے کی ان تھک مسلسل کوششیں نہ فرماتے تو نہ جانے آج تعلیم یافتہ مسلمان لڑکیوں کا کیا حشر ہوتا۔ "جوہر قدامت"، "سراب مغرب"، "بنت الوقت"، "ستونتی"، جیسی مشہور تصانیف اسی موضوع پر ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد مضامین عصمت بنات تمدن وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ جن میں سے بعض مضامین تو گذشتہ مجموعوں میں آچکے ہیں اور ۱۶ سولہ مضمونوں کا مجموعہ یہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اصلاح رسوم پر اور جہالت کے خلاف مصورِ غم سے زیادہ کسی نے نہیں لکھا۔ لیکن اس صدی کے مصلح اعظم نے خذ ما صفا ودع ما کدر پر ہمیشہ زور دیا اور بار بار تحریر فرمایا کہ مغرب کی اچھی چیزیں ضرور لو مگر اپنی خوبیوں کو فنا نہ کرو۔ "عروسِ مشرق" میں مشرقی معاشرت اور تہذیب کے بعض زریں اصولوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ جنہیں ہم نے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ لیکن جنھیں قائم رکھنے سے ہی مشرق کے بسنے والے کامیابی کی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔

۲۶ اگست ۱۹۳۶ء

رازق الخیری

اگلی برساتوں کی ایک جھلک

جب ہم ترقی کی موجودہ رفتار پر نظر ڈال کر دیکھتے ہیں کہ وقت رہروانِ ثانی کے نقش قدم تک مٹاتے چلا جا رہا ہے اور آج شجرِ زندگی کی ہر شاخ تہذیب ہو یا تمدن اپنی حالت میں خوشی اور کیفیت میں مگن ہے تو اُس دورِ آخر کی یاد جس کی اب جھلک کو بھی آنکھیں ترستی ہیں کلیجے کے ٹکڑے اُڑا دیتی ہے۔ وہی زمین و آسمان ہے وہی ہندو اور مسلمان وہی صبح اور شام ہے وہی دن اور راتیں مگر وہ معاملے اور باتیں جو جری ہوئیں ختم ہوئیں اور ملیامیٹ ہو گئیں۔ ترقی کا خبط تسمہ پا کی طرح زندگی کی ہر کیفیت میں چمٹا ہوا ہے۔ حد یہ ہے کہ فرحت کا خندہ اور الم کا نالہ بھی ترقی سے وابستہ ہے۔ یہ تغیر بجائے خود قابلِ استعجاب نہیں۔ لائقِ حیرت وہ ملک وہ وطن اور وہ لوگ ہیں جو نشۂ تقلید میں مست ہو کر اتنے بیخود ہو جائیں کہ وطن کی آنکھ پر

فہرست مضامین "عروسِ مشرق"

جان آگئی۔ کوئل کی آواز دُور سے کانوں میں آرہی ہے۔ پپیہا ایک طرف بیٹھا بول رہا ہے اور یہ تمام کیفیات اِس لئے کہ قیامت خیز گرمی نے جان پر بنا دی تھی۔ طبیعت پر خاص اثر پیدا کر رہی ہیں۔ جھوٹی ترقی نے جو گل کھلائے وہ پوشیدہ نہیں۔ جہالت اِس ضرورت کو محسوس کر رہی تھی جس کو "اعلیٰ تعلیم" نے نظر انداز کر کے ملک کو تہذیب کی آڑ میں ناقابل تلافی نقصان پہنچا دیا اور جس خاک سے عصمت کی کامل دیویاں اُٹھیں وہاں بنگال کے مشہور جلسہ جیسی عورتیں سرِ راہ ناچنے لگیں۔

ہندوستانیوں کا عقیدہ یہ ہمیشہ رہا کہ پھاگن کے مہینہ میں مرد کے اور ساون بھادوں میں عورت کے خیالات موسم کی مناسبت سے یادِ محبوب کی طرف خصوصیت سے متوجہ ہوتے ہیں اور حالات اُن کے جذبات کو اسقدر منتشر کر دیتے ہیں کہ وہ اُس کے سوا سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

ادب کی جو تفریق آج وقت نے کر دی ہے اُس وقت نہ تھی۔ ہندی اُردو کا جھگڑا تو اب بیس برس سے کانوں میں پڑنا شروع ہوا ہے اس وقت اُردو آہستہ آہستہ ترقی کر رہی تھی اور گو بہت کچھ کر چکی تھی مگر مُسلمانوں کا تمدن ہندی جذبات سے بغلگیر ہونے میں تعصب سے ہزاروں کوس دُور تھا اور ہندی گیت دوہے ٹھمریاں مُسلمانوں میں رل مل کر اس طرح شیر و شکر ہوئی تھیں کہ آج سے پچاس برس پہلے کی شاید ہی کوئی مُسلمان عورت ایسی ہو جسے ہندی کا ایک آدھ گیت نہ آتا ہو۔ اُردو جس وقت تک اتنی صاف نہ ہوئی تھی اُس وقت تک خود اُردو اہلِ قلم کی زبان وہی تھی جو اب ٹھیٹ ہندی سمجھی

اغیار کے ہم آہنگ ہوں۔ آبائی جوہر اُن کو عار اور مایۂ ناز خزائن کو ننگ خیال کریں۔

ترقی کی حد آخر خلقت ہی پر ختم نہیں ہوئی۔ قدرت بھی یوماً فیوماً اور لمحہ بہ لمحہ ترقی کر رہی ہے۔ ہندوستانی عروسِ فلک جو برسات میں پندرہ پندرہ دن جھڑیاں لگاتی تھی ایسی مہذب بنی کہ کبھی بہت مہربان ہوئی تو ایک دو روز دہ بھی مارے باندھے اور بہ جبر واستکراہ لب نازک پر مسّی لگالی، ورنہ ساون بھادوں کا مہینہ اور دھویا دھایا دیدہ صاف۔ پیداوار کی ترقی اِس درجہ کو پہونچی کہ وہ اناج جس کو کوئی ٹکے سیر بھی نہ پوچھتا تھا۔ چھاج اور چھلنیاں چھوڑ فینسی مشینوں میں باوا دادا کے مولوں صورت دکھا رہا ہے۔

ترقی کی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے آسمان زمین کو مبارک ملک و وطن کو نصیب مگر ہم تو اسی قدامت کے عاشق اور جہالت کے شیدا ہیں جس کو ترقی کی رَو فنا کر گئی اور اب جس کی صورت دوبارہ نظر آنی مشکل اور محال۔

آج خواتین کا تہذیب یافتہ گروہ برسات میں سفید لباس پہنے ڈاسن کا بوٹ اڑائے پارک کی روشوں پر چھتریاں ہاتھ میں لئے ٹہلتا نظر آتا ہے اور بنگلوں اور کوٹھیوں پر احتیاط کرتا ہے کہ ہوا خراب نہ ہونے پائے۔ جہالت اپنے دور میں خواتین سے برسات کا استقبال کس طرح کرواتی تھی اس کی ایک دھندلی سی تصویر موجود ہے۔

آسمان پر کالی کالی گھٹائیں نمودار ہو گئیں۔ بادل اُمنڈ اُمنڈ کر گھر آئے۔ جیٹھ اور بیساکھ کی تپی ہوئی آنکھوں میں پانی بھرے۔ ہوا کے جھونکوں سے جان میں

تھا کہ گئی گرمی اور گھس میں لڑکیاں جو جوانی کی وجہ سے گرمی کی پروا کرتی ہیں یا نہ سردی کی اندر دالانوں میں گھٹی بیٹھی رہیں ذرا باہر نکل کر صحن میں بھی آئیں اور جھولا قدرتی پنکھا بن کر ان کو ہوا پہنچائے۔ اب ذرا اس وقت کی باتوں پر نظر ڈالو۔ محبت کی گھٹائیں جھوم جھوم کر اُمنڈ رہی ہیں۔ مہینوں کی چھوٹی ہوئی لڑکیاں جن کی آنکھیں میکے کے کاجل کو سُسرال میں تڑپ گئی تھیں اسی بہانے باپ بھائی کے گھر جمع ہوتی ہیں۔ کھمب گڑے ہیں۔ ہنڈولے پڑے ہیں۔ کواریاں اور بیاہیاں برابر کی سہیلیاں ساون کے طفیل مدتوں بعد مل جلکر رنگ رلیاں منا رہی ہیں۔ بہ ظاہر یہ سوت اور ریشم اور مونجھ اور بان کی رسیاں اور ڈوریاں ہوں مگر درحقیقت خلوص و صداقت کے وہ پھندے ہیں جو مدۃ العمر گلوگیر رہیں گے۔ اور اِس پُر لطف منظر کو تادم واپسین فراموش نہ ہونے دینگے۔

جھولے کے ایک رقعہ کا آخری شعر یاد آگیا اور دل تڑپ گیا کہ اللہ اللہ کیا کیا چیزیں غارت ہوگئیں۔ لڑکی کا جھولا ہے بلاوے پھر رہے ہیں۔ شرکت کے واسطے منتیں خوشامدیں ہو رہی ہیں۔ رقعہ منظوم ہے برسات کا سماں کھینچا گیا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے غالباً منشی ذکاء اللہ مرحوم کی پوتی کا جھولا تھا اور آخری شعر یہ تھا۔

بلاوا ہے جھولے کا مت بھولنا جھُلانا ہمیں اور خود جھُولنا

جہالت سے تعبیر کر دیا حماقت سے مگر ہم تو یہ ہی کہیں گے کہ چمنستان مشرق کی بہار وداع ہو چکی۔ دنیا اس ترقی پر نازاں ہو اور ہم اپنا منہ پیٹ کر کہیں کہ بھرے میلے بچھڑ گئے لہلہاتے پودے اجڑ گئے اور بنے کھیل بگڑ گئے۔

جا سکتی ہے۔ مثلاً امیر خسرو بنو کی کی پہیلی فرماتے ہیں۔

تر ور سے ایک تریا اتری اُسنے بہت سجھایا باپ کا اسکے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا

آدھا نام پتا پر پیارا بوجھ پہیلی موری امیر خسرو یوں کہیں اپنے نام نبولی

مکرنی ہے

سگری رین موسے سنگ جاگا بھور بھئی تب بچھڑن لاگا

اسکے بچھڑے پھاٹت ہیا اے سکھی ساجن نا سکھی دیا

ہم کو اس وقت زبان سے مفصل بحث کرنی مقصود نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ تمدن جاہلیت اپنی اشد ضرورتوں کو کس طرح پورا کر رہا تھا۔ ہولی کے موقعہ پر جس وقت مرد گاتے تھے یہ ہولی اکثر کی زبان سے ادا ہوتی تھی۔

ہولی آج جلو چاہے کال مورا کنور کنہیا نی موسے آن ملو جی

ہولی آج جلو چاہے کال

یہ معمولی باتیں مٹنے والے تمدن ہی کی رہبر نہیں بلکہ یہ بھی بتا رہی ہیں کہ اس زندگی کا عین مقصد کیا تھا۔ جو چیز اس وقت "کیرکٹر" کہی جاتی ہے اُسکی اصلاح گرد و پیش کے حالات سے اعمال سے اقوال سے غرض ہر طرح سے کی جاتی تھی اور اگر حسینۂ ترقی معاف کرے تو کہوں گا کہ جہالت کا دیو مہیب باعتبار کیرکٹر اب سے زیادہ خوشنما تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا برسات کے کالے اودے بادل گھنگور گھٹائیں کوئل اور پپیہا عورت کی حالت میں آسمان و زمین کا فرق پیدا کر دیتے تھے۔ دلی میں بھی اور دوسرے مقامات پر بھی دستور تھا اگرچہ اب برائے نام رہ گیا کہ برسات میں عورتوں کے واسطے گھر گڑتے تھے جس کا کھلا ہوا منشا تو یہ

مسافر کے راستہ کی تکان محسوس کر اور گوری تھوڑا سا پانی پلا دے۔ پیاسا ہوں''

دورِ ترقی نے مرد اور عورت کی خصوصیت کو مٹا دیا اور روز بروز مٹ رہی ہیں۔ اِس وقت ہر مرد اور عورت کو خلیق ہونا ضروری ہے۔ جاہلوں کی کوشش یہ تھی کہ لڑکیاں غیر مردوں کے ساتھ ہمیشہ کج خلق ہوں اُن کو کسی غیر مرد سے خندہ پیشانی سے بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ لڑکی پانی کے جواب میں انسانیت کو ہاتھ سے نہیں کھوتی۔ ڈول رسّی چھوڑ الگ کھڑی ہو جاتی ہے۔ مگر چونکہ اس کے طریقہ سوال پر شبہ ہوتا ہے اس لئے کہتی ہے۔

بھر پیو چھیلا بھر پیو میری صورت نہ دیکھ نہ بھول
جس رے سوامی کی میں پالی بھورا تو تجھ سے راج مزدُو

بحث ردلیف و قافیہ کی نہیں میں نے عورتوں کی زبانی سُنا ہے مجھ تک پہنچتے پہنچتے بہت کچھ تبدیلی ہو گئی ہو گی۔ ذکر مضمون کا ہے۔ مسافر کی صعوبت کے خیال نے یہ جواب دلوا دیا کہ ''خود بھر لو مگر شبہ نے فوراً یہ کہلوایا کہ ''میری صورت پر نہ بھولیو میں جس کی ملکیت ہوں اُس کے ہاں تجھ جیسے راج مزدور ہیں''۔

مسافر بھی ایسا ویسا نہ تھا۔ کہتا کیا ہے:۔

چلی جا ری گوری پاتری اور مت کر سان گمان
جس رے گوری کے ہم پالے سندر پا تو تجھ سی بھرن نیپا

لڑکی نے پانی کا گھڑا اُٹھا لیا تھا۔ کہتا ہے ''جا چلی جا کچھ ایسا ویسا خیال نہ کیجئے میں جس کا شوہر ہوں اُس کے ہاں تجھ جیسی پانی بھرتی ہیں''۔ یہ جواب سے

میرے عزیز و ہنسنے سے پہلے بات سن لو ہنسو خدا تم کو ہنستا رکھے۔
مگر اس جہالت کا بھی چھوٹا سا منظر دیکھ لو۔

کڑھائیاں چڑھی ہوئی ہیں اور آج بہتر سے بہتر دوائیں اور چیزیں جو طبیب اور ڈاکٹر ہیضہ کے دنوں میں استعمال کرواتے ہیں اُن کی احتیاط پہلے ہی کر لی گئی۔ اور پکوان میں وہ تمام مصالحے ڈال دیتے گئے جو ایک جھولا کیا اگر بمبئی سے لندن تک کا سفر کر ڈالو تو قے نہ ہونے دے۔

آموں کی جھلیاں رکھی ہوئی ہیں، جامنوں کے ٹوکرے دھرے ہوئے ہیں۔ جھولے جھول رہی ہیں اور کھار ہی ہیں۔ مل رہی ہیں اور گا رہی ہیں۔ یہ سب کچھ میسر ہے باغ باغ نہال نہال ہیں مگر معاملہ کی بات یہ ہے کہ باپ بھائی دیور جیٹھ ساس خسر کی آنکھوں کے سامنے۔ تنہا جلسوں اور اکیلے سفروں میں نہیں۔ جہاں کسی قسم کی روک نہ ٹوک۔ اور پوچھ ہو نہ گچھ۔

خدا غریق رحمت کرے مرنے والوں کو آدمی نہیں فرشتے تھے کہ اگر ملک موجودہ ترقی نہ کرتا تو اُن کے بوئے ہوتے بیج سدا بہار پھول بن سکتے۔

ذرا اس تعلیم کو ملاحظہ فرمائیے کہ جھولے کے گیت لڑکیوں کو کیا تعلیم دے رہے ہیں۔ دو جھول رہی ہیں چار پانچ جھلا رہی ہیں اور گیت اسطرح شروع ہوتا ہے۔

پیاسے کو پانی پلا میری گوری تو راہ مسافر جان

کنوئیں پر لڑکیاں پانی بھر رہی ہیں۔ ایک مسافر تھکا ہارا آنکلا۔ دیکھا ہے تو ایک لڑکی نشۂ شباب میں چُور ڈول کھینچ رہی ہے۔ ٹھٹک گیا اور کہنے لگا۔

میاں مٹھّو کی بکواس

ترقی کی صدائیں چاروں طرف سے کان میں آرہی ہیں۔ سنتا ہوں کہ تعلیم یافتہ لڑکیاں جہالت کا برقع اُتار تہذیب کے زرق برق لباس سے آراستہ ہوگئیں۔ دیکھتا ہوں کہ جن سڑکوں پر دور رویہ خودرو درختوں کی قطار خاموش کھڑی تھی وہاں خوشنما پارک اور دلکش روشیں باآوازِ بلند وقت کا راگ گارہی ہیں۔ کیسا تعجب انگیز انقلاب ہے۔ جو باتیں نصف صدی سے پیشتر عیب تھیں وہ آج ہنر ہیں۔ جو جب باعثِ شرم وہ اب مایۂ ناز۔

قدیم سڑکیں اُجڑ چکیں سرسبز و شاداب درخت مٹ گئے۔ ہری ہری گھاس رنگ برنگ کے پھول آنکھوں کو خیرہ کررہے ہیں۔ مگر ذرا وہ مشرق کی طرف دیکھو۔ اِس ٹُنڈے درخت کی سوکھی ہوئی ٹہنی پر ایک بُڈھا پرند دَورِ گذشتہ کا مرثیہ پڑھ رہا ہے۔ آواز دلکش اور نغمہ سریلا نہیں۔ مگر مٹنے والوں کی فانی یادگار ہے۔

بیان کرنے کے بعد حُسنِ ظاہری کے متعلق کہتا ہے کہ "تجھکو سُنار نے گھڑا ہے" یعنی نہایت خوبصورت ہے۔ عورت جواب میں کہتی ہے۔

نا میں سانچے اُتری اور نہ مجھے گھڑا ہے سُنار
جنم دیا مائی باپ نے، تو روپ دیا کرتار

"میں کس قابل ہوں جو سچے نکلوں گی اور سُنار کی انگوٹھی بنوں گی۔ ماں باپ کے ہاں پیدا ہوئی جو بُری بھلی صورت ہے یہ خدا نے دی"۔

میں کہتا ہوں جاہلیت عصمت کے متعلق اُن کو زندگی کے ہر شعبہ میں کیسی تلقین کر رہی تھی کہ اِس تفریح میں بھی ان کے دلنشین ایسی باتیں ہوتی تھیں۔ آج ترقی جس طرح تمام جوہر مٹا رہی ہے اسی طرح وہ تمدن بھی فنا ہو چکا۔ لیکن یہ میرا یقین ہے کہ وہ وقت آئے گا جب مُلک عہدِ گزشتہ کو سر پہ ہاتھ رکھکر روئے گا اور آج جس کو ترقی سمجھتا ہے اسپر لعنت بھیجے گا۔ اور جس کو جہالت کہتا ہے اس کی تسبیح جپے گا۔

خطیب ۱۹۱۵ء

ہیں ان دلوں میں ان ہاتھوں میں جن کی بدولت مسلمانوں کے تمدن کو یہ چاند لگے اور جاہل لڑکیاں تہذیب کے زیور سے ایسی آراستہ و پیراستہ ہوئیں۔

کھسکے کہاں؟ اس بڈھے طوطے کی بھی تو ٹیں ٹیں سن لو جی تو ضرور گھبرائیگا اوّل تو صورت ہی جھرکٹوں کی ہے۔ بال اور پر سب جھڑے ہوئے۔ دوسرے مسکن ہے تو وہ نورٌ علیٰ نور۔ سبز پنجرے کا نام نہیں۔ کٹر نک ٹھہنا موٹا لکڑ۔

"کیوں میاں مٹھو کیا حال ہے؟"

"نبی جی بھیجو"

"میاں مٹھو یہ پرانے راگ کب تک گاؤ گے۔ اب اللہ دے کا وقت ہے نہ نبی جی بھیجو کا۔ اب تو یہ کہو ترقی کرو۔ دیکھو میاں مٹھو سامنے شادی رچ رہی تھی۔ کیا مزہ آر ہا تھا"

میاں مٹھو نے سفید پلکوں میں نیلے نیلے دیدے بدلے اور کہا:۔

"نبی جی بھیجو"

"مٹھو ان باتوں میں کیا رکھا ہے"

مٹھو سامنے آتے قہقہہ لگایا اور کہا:۔

اس تہذیب اور ترقی کا انحصار بچوں کی قابلیت پر ہے۔ بچھو نے اسی لئے اُجلے محفلیں اسی لئے ستھری۔ کپڑے اسی لئے نفیس اور جلسے اسی لئے خاموش ہیں۔ بچے کیسے ہی مہذب اور کتنے ہی تمیزدار کیوں نہ ہوں ان کی موجودگی کا اثر کچھ نہ کچھ پڑے اور ضرور پڑے۔ ضرورت تھی کہ لڑکیاں پہلے بچوں کی پرورش سیکھتیں مگر انھوں نے آرائش سیکھا۔ کیا تم نہیں دیکھتے اور نہیں سنتے کہ

عقل سٹھیا گئی۔ دماغ چکرا گیا۔ سُنو اور ہنسو۔

کدھر چلے؟ مکروہ آواز لایعنی صدا کیوں وقت ضائع اور دماغ پراگندہ کیا۔ اِدھر آؤ کیسا پرلطف منظر اور دلکش سماں ہے۔ بیٹے کی شادی ہے مہمان جمع ہیں۔ عالیشان مکان۔ اجلا سپید فرش۔ میزیں کرسیاں۔ پیانو ہارمونیم دلبستگی کیلئے تمام سامان موجود ہیں۔ صاف سُتھری پڑھی لکھی بیویاں قرینہ سے بیٹھی معقول گفتگو کر رہی ہیں۔ غل نہیں۔ غپاڑہ نہیں۔ بچے نہیں۔ کچے نہیں۔ مہذب محفل سنجیدہ باتیں۔ آنکھیں دیکھ دیکھ کر اور دل سُن سُن کر نہال نہال اور باغ باغ ہوتے ہیں! او ہو دولہا کی اماں تشریف لے آئیں! مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ لڑکیوں نے باجے سنبھالے۔ ترانہ کا مسدس پڑھا۔ مؤثر نظمیں ہوئیں۔ قومی غزلیں ہوئیں۔ کوئی دستور نہ رسم۔ ٹونہ نہ ٹوٹکا۔ برات کا وقت آیا۔ دولہا۔ دولہا کے ابا۔ دو چار اور مہمان باہر ہی باہر لڑکی کے ہاں جا نکاح پڑھ دولہن بیاہ لائے۔

کیسا سیدھا سادھا طریقہ ہے۔ یہ شادی یقیناً یہ حق رکھتی ہے کہ اسکے حالات اخبار اور رسالوں میں شائع کئے جائیں تاکہ دوسری بہنوں کے واسطے نمونہ ہو۔ دولھا غریب کی چھٹی آج ہی ختم ہے۔ دیکھو تعلیم کے یہ معنی ہیں انسانیت اس کا نام ہے۔ چلتے وقت لڑکے نے ماں اور باپ دونوں سے ہاتھ ملا کر شکریہ ادا کیا۔ بہن بھائیوں کی تکلیف کا اعتراف کیا اور دولہا دلہن رخصت ہوئے۔

سُبحان اللہ کیا اچھا سماں ہے۔ کسے اُمید تھی کہ قوم تاریکی کے غاروں سے نکلکر تہذیب کے محلوں میں اِس طرح جلوہ گر ہوگی۔ خدا برکت دے ان دماغوں

کہاں تک پورا کیا اور اگر تہذیب و تمدن اسی رفتار سے بڑھا تو تین چار صدی بعد ہندوستان کی سرزمین پر جہاں آج سات کروڑ کے قریب مسلمان ہیں کتنے مُسلمان ہوں گے۔ گستاخی ہوئی گستاخی معاف کیجے۔ معاف کیجے۔

توبہ توبہ۔ نادم۔ شرمسار۔

جی ہاں میں نے بھی شادی دیکھی ماشاء اللہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ اتنی ترقی کر گئے کہ وہ بیہودہ رسمیں جنہوں نے برباد کر رکھا تھا نیست و نابود ہو گئیں۔ اور مرد تو مرد عورتیں تک قوم کی پستی اور ذلت کو محسوس کرنے لگیں۔ مگر بھائیوں کیچڑ کا کیڑا تو کیچڑ ہی میں خوش ہے۔ قالین کی قدر کیا جانے۔ میری چرب زبانی معاف کرنا میں نے تو جاہلوں میں وہ کچھ دیکھ لیا کہ یہ تمہاری تہذیب اور کنڈر گارٹن ہزار دفعہ قربان نعوذ باللہ لاحول ولا قوۃ معاف فرمائیے بے ادبی ہوئی۔ اچھا ذرا عالمِ خیال میں میرے ساتھ ایک تماشہ دیکھ لیجئے۔ میری زبان سے اور اپنی آنکھ سے۔

بھان متی کا تماشہ اور مداری کا سانگ ہے مزیدار بھی اور کار آمد بھی۔ ضد سے شے کی وقعت معلوم ہوتی ہے۔ اِن سگھڑ بیویوں کی قدر تم کو اُن پھوہڑوں کے حالات سے ہو گی جن سے الحمد للہ دنیا پاک ہوئی مگر کیا کروں میں نے تو ان کا نمک کھایا ہے۔ انھیں کے گیت گاؤں گا۔ بڈھا ہوں حافظہ خراب ہو گیا۔ بات یاد نہیں رہتی۔ میں نے شائد ابھی تم سے کہا ہے کہ نسوانی زندگی کا پہلا قدم بچوں کی پرورش اور دوسرا ترقی ہوتا۔ جانور کی رائے کیا۔ غلط یقیناً غلط۔ مگر جو دیکھا ہے وہ کہتا ہوں۔ پھوہڑیں جہالت یعنی خدا کی

مہذب بیویاں اور معقول شوہر بچوں کی پیدائش سے گھبرا رہے ہیں اور ان لوگوں کو چھوڑ کر جہاں روپے کی ریل پیل ہو پیدائش مصیبت سے تعبیر کیگئی ہو۔ اور یہ قریب قریب فیصلہ ہوگیا ہے اور ہوکیا گیا ہے ظاہر ہے کہ بچوں والیاں کسی جلسہ کی شرکت کسی محفل کی شمولیت اگر کریں تو خود بدمزہ ہونے کے علاوہ اپنے بچوں سے دوسروں کو بھی بے لطف کردیں گی۔ اور جب قومی ترقی بغیر نسوانی کوشش کے ممکن نہیں تو اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ بچے اس راہ میں حائل ہونگے۔ میں حاشا وکلا جانور ہوکر آدمیوں پر اور آدمی بھی مہذب معترض نہیں مگر ایک بات کہہ رہا ہوں۔ ہے تو بالکل بکواس لیکن پہلے سُن لو پھر رائے دینا۔

لڑکیوں نے ترقی کا سبق مغرب سے سیکھا۔ بجا کیا درست کیا خوب کیا۔ مناسب تھا مصلحت تھی ضرورت تھی۔ مگر سب سے مقدم بچوں کی پرورش کا سبق یاد کرنا تھا۔ دوسرا قدم ترقی کا ہوتا تو مجھ جانور کی رائے میں اولی تھا۔ تم کو مجھسے زیادہ معلوم ہوگا کہ یورپ میں شرح پیدائش رُوبہ تنزل ہے۔ فرانس اس مصیبت کو پیٹ رہا ہے۔ اور اس آفت کا علاج کثرت ازدواج کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ نصف صدی سے برطانیہ بھی اس مرض میں مبتلا ہے ان حالات میں مجھکو حق تو نہیں ہے مگر جانور کی بات پر کبھی فرصت میں غور کرنا اور ایک مہذب بیوی سے بڑھاپے میں پوچھنا کہ بیگم تمہاری اماں کتنے بچے چھوڑ کر مریں اور نانی کتنے۔ اب تم کتنے چھوڑو گی۔ قدرت کا منشا انسانی ہستی سے محض بقائے نسل ہو۔ تم نے ترقی کی تو خوب کی مگر قدرت کا منشاء

دماغ کو نصف صدی پیچھے ہٹا لو۔

مذہب کی خوشنما پریاں فضائے عالم میں اُڑ رہی ہیں۔ دنیائے نسواں ان کے سایہ میں توحید کے نغمہ گا رہی ہے۔ خلوص کی روشنی سے در و دیوار جگمگا اُٹھے ہیں۔ چھوٹا بڑا مرد عورت ہر متنفس اس مقدس ہستی کے نام پر فدا ہے جو حلیمہ کے دودھ سے پروان چڑھی۔

گریبان میں مُنہ ڈال کر کہو یہ دورِ جہالت ہے؟ ان عورتوں کے دلوں میں ان کے کچے پکے گھروں میں ترقی کے نعرے اور ہمدردی کی لن ترانیاں نہیں۔ ان کے دل نور اسلام سے روشن۔ ان کی زبانیں خلوص سے آراستہ اور ان کے سینے زیور انسانیت سے چمک رہے ہیں۔ تمہارے محل دو محلے تمہارے قصر اور منزلیں ان شکستہ دیواروں پہ فدا ہوں گی۔ جہاں کلام الٰہی کے دریا حدیث نبوی کی نہریں لہریں لے رہی ہیں۔ تم ان گھروں کو اِس سرے سے اُس سرے تک دیکھ جاؤ چپہ چپہ چھانو اور کونہ کونہ ڈھونڈو تم کو ایک صورت بھی نفسانیت میں غرق نظر نہ آئے گی۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں شوہروں کی راحت پر قربان کر دیں یہ وہ ہیں جنہوں نے کڑکڑاتے جاڑوں میں چلچلاتی دھوپ میں دُکھ میں سُکھ میں تندرستی میں بیماری میں شکر کے سوا دوسری بات نہ کہی۔

ان کی مقدس روحوں پر سلام بھیجو اور کہو خوش نصیب تھیں وہ مٹنے والیاں جو خود فنا ہو گئیں مگر ان کے نام زندہ اور کام باقی ہیں۔

چلو میرے ساتھ چلو میں بھی ایک شادی دکھاؤں۔ دیکھو یہاں بھی بیٹے

عظمت کا سکہ معصوم دلوں پر بٹھانا فرض سمجھتی تھیں۔ یہ کوشش یعنی مذہبیت تھی تو فضول۔ اِس خیال میں مَیں تم سے متفق ہوں مگر تھوڑی دیر کو مسجدوں میں گہما گہمی اور گھروں میں اللہ کا نام جپ لیا جاتا تھا۔ کھیل تھے وہ اِسی قسم کے کہانیاں تھیں وہ اِسی ڈھنگ کی۔ معاملے تھے وہ اسی وضع کے۔ باتیں تھیں وہ اسی طرح کی۔ یہ تھی تو لغویت، آج میں خود سمجھ رہاں لیکن اِس لغویت میں کچھ انسانیت بھی تھی۔ مجھ میں اب طاقت پرواز نہیں۔ ایک پتھر مار دو گے تو ٹیں کر کے رہ جاؤں گا۔ میں ان کا مدّاح نہیں تمھارا ہمنوا ہوں۔ کِس قدر بیوقوف تھیں کہ جِن بھوت کا کھٹکا دال چپاتی اور بری شادی کا اندیشہ گھٹی میں ڈالکر مردوں کو عورتوں سے بدتر بنا دیتی تھیں۔ مگر جس چیز کو "کیرکیٹر" کہتے ہیں اُس پر حرف نہ آنے پاتا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ لڑکے ماں باپ کی آنکھ سے غروب آفتاب کے بعد اوجھل نہ ہونے پائیں۔ یہ کمزوری شادی کے قابل ہونے سے شادی ہونے تک اُن کے چال چلن کی پوری محافظ اور کافی نگراں تھی۔

بی پھپھو۔ مدد اللہ کی.............. توبہ توبہ معاف کیجئے۔

اچھا تو اب تم ہنسو اور مَیں روؤں۔

دیکھو کیسی سیاہ گھٹا سامنے سے جھوم کر اُٹھی۔ خلوص کے بھرے ہوئے بادل بساط اسلام پر دوڑتے پھر رہے ہیں۔ قلوب نسوانی کی سرسبز کھیتیاں جو خوف ورجا کے جھگڑوں سے پامال ہو چکی تھیں آسمان کا مُنہ تک رہی ہیں۔ رحمت کی ٹھنڈی ہواؤں اور میٹھی صداؤں نے دل کے کنول کھلا دیئے۔ لو پھوار شروع ہو گئی۔ بس جل تھل ہوا۔ وقت کا خیال چھوڑو اور

کہہ رہی ہے کہ "یہ شادی معمولی بات نہیں۔ اے دولہا تیری مدّتوں کی مراد ہے جو خدا نے آج پوری کی۔ اب تو جب تک زندہ ہے اور جس وقت تک یہ اِس بات کو یاد رکھیو"

دبی زبان سے یہ اشارہ کرنے کے بعد اپنی سہیلی کی طرف سے دولہا کے حُسن کی تعریف کرتی ہے اور اِس سلسلہ میں ایک عجیب معاملہ نہایت خوبصورتی سے بیان کرتی ہے۔

دولہا کی اَمّا بھی بنی دولہا کے ابّا بھی بنے
چل کے دیکھو ری سکھی سب ہیں سوا یاری بنا

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دلہن کے ماباپ نے کپڑے وغیرہ نہ بدلے تھے جو وہ صرف دولہا کا مقابلہ اُس کے والدین سے کرکے اسکو ترجیح دیتی ہے۔

جواب یہ ہے کہ جس وقت کا وہ ذکر کر رہی ہے اُس وقت کی ایک جاہلانہ رسم یہ بھی تھی کہ دولہن کی ما دولہا کی ما کے کسی عزیز کے سامنے نہ آتی تھی۔ اور اِس لئے کپڑے بدلتی تھی نہ سر گوندھتی تھی۔ بڑی وجہ یہ تھی کہ جہیز کے دینے والے میں جس میں برتن بھانڈا بھی شامل تھا کپڑوں کے خراب ہونے کا احتمال تھا اور باعتبار تعلق ایک قسم کا حجاب سا بھی تھا۔ نہ زنانے میں ما سامنے آتی تھی نہ مردانے میں باپ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن یہ ضرورت کہاں تک اور حجاب کب تک۔ اِس لئے چوتھی میں "سمدھن ملاوا" ہوتا تھا اور دونوں سمدھنیں بیٹے کی ما اور بیٹی کی ما گلے ملکر خدا سے دعا مانگتی تھیں کہ یہ تعلق بخیر و خوبی انجام پائے۔ مجھے اِس وقت اِس رسم پر بحث کرنی نہیں۔ مگر تم نے دیکھا وہ سہیلی کس مزہ سے

کا بیاہ رچ رہا ہے۔ مہذب شادی دیکھ چکے یہ جاہلوں کی شادی بھی دیکھو وہاں پیانو اور مسدس تھا۔ ہارمونیم اور ترانہ تھا یہاں دائرہ اور گیت ہیں۔ دف اور سہاگ ہیں۔ میں شرع کا نام لوں گا تو گردن اڑا دینا مگر ایمان سے کہنا ایسا فنا فی القوم ہونے کا دعویٰ کہ دولہا کے زنانہ میں داخل ہوتے ہی ہارمونیم کی یہ لے اور گانے والے کی یہ صدا کہ

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہے

کہاں تک جائز ہے؟ لو اب جاہلوں کی بکواس سنو:۔

"بنا بنڑی کے لئے شبھ گھڑی آیا ری بنا"

تم کہو گے یہ شبھ گھڑی ہندوؤں کے تمدن کا اثر لغویت نہیں تو کیا ہے میں کہتا ہوں مستقبل کے واسطے نیک فال ہرگز گناہ نہیں۔ سب سے پہلی بات دولہا کے داخل ہوتے ہی جو اُس کے کان میں پڑتی ہے وہ کس قدر خوشگوار ہے۔

"بنا بنڑی کے لئے شبھ گھڑی آیا ری بنا"

اس کو عمر بھر ان الفاظ کی لاج رکھنی ہے۔

کچھ یہ بھی خبر ہے یہ کون کہہ رہا ہے؟ دلہن کی ایک سہیلی۔ کیا تم اس جذبہ کی جو ایک ساتھ کی کھیلی بچپن کی سہیلی کے دل میں اس لئے کہ اسکی شادی ہو چکی ہے۔ پیدا ہوا داد نہ دو گے؟ وہ اس کا اظہار اس طرح کرتی ہے۔

یہ میرا ہریالا بنا یہ مرادوں پایا بنا
بنا بنڑی کے لئے شبھ گھڑی آیا ری بنا

تبنو سے کیا مقصد ہے۔ خاموش کیوں ہو گئے۔ میں بتاؤں یہ سنّت رسول ہے۔ ہنستے کیوں ہو یہ جاہلوں کا حُسن عقیدت تھا۔ ان جاہلوں کا جنکی رگ رگ میں اسلام موجود تھا فقط زبانی دعوے نہ تھے۔

اکتا کیوں گئے میں خود اپنی ٹرو اس ختم کر رہا ہوں۔ اجازت ہو تو ایک بات اور کہدوں۔ دیکھو مذہب اس کا نام ہے۔

ماں کے قدموں میں گرا باپ کی چھاتی سے لگا
بہنوں کے آنچل تلے کھیلتا آ یا ری بنا

خدا نے جو یہ خوشی کی گھڑی دکھائی کہ وہ گوشت کا لوتھڑا جو مکھی اڑانے کے قابل بھی نہ تھا آج اس لائق ہوا کہ دولہا بنے اور جوان ہو تو سب سے پہلے ان قدموں میں گرتا ہے جو جنّت ہیں۔ اسکے بعد باپ کی چھاتی سے لگتا ہے!

کیا اس تخیل کی جس میں مراتب کا اس قدر اچھا لحاظ رکھا گیا تھا داد نہ دوگے ؟

تم پیٹ بھر کر ہنس لو ایک بات اور کہوں گا۔ جہالت کی ایک رسم یہ بھی تھی کہ جب دولہا زنانہ میں آتا تھا تو بہنیں اپنے دوپٹوں کے آنچل اُسکے سر پر ڈال کر اندر لاتی تھیں۔ مجھے اس رسم سے مفصل بحث کرنی نہیں صرف اتنا کہتا ہوں کہ بہن بھائیوں کے جوشِ محبت کو ترقی دینے کے علاوہ اس میں خاص مصلحت یہ تھی کہ سخت گرمی کا موسم ہے دولہا گھنٹوں سے کپڑے پہنے جکڑا بیٹھا ہے۔ بہنوں کے آنچل چھتری کا کام دیں گے اور

کہہ رہی ہے۔

چلکے دیکھو ری سکھی سب میں سوا یاری بنا

اب آگے بڑھو تمہارا وقت تو ضرور ضایع ہو رہا ہے۔ مگر کیا کروں مجھے ایک خاص قسم کا لُطف آ رہا ہے۔ ہائے مشرق تیرے سب جوہر فنا ہو گئے اور مُلک اس پر فخر کر رہا ہے۔

یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ میزبان مہمان کے سامنے انواع و اقسام کے کھانے رکھ کر بھی کسرِ نفسی سے دال دلیا ہی کہتا ہے۔ لیکن اِس دلہن کی سہیلی دُنیا سے اُلٹی بات کہہ رہی ہے۔

سیجیں مخمل کی بچھیں تکیے مشجر کے لگے
نور کے تنبو تلے لا کے بٹھا یاری بنا

میں ایک بات اور عرض کر دوں ذرا اپنے قہقہے کم کیجئے اور سُن لیجئے۔ دورِ جہالت میں ہر غریب سے غریب اور فقیر سے فقیر کو یہ حق حاصل تھا کہ بیٹی کے بیاہ میں امیر سے امیر اور بڑے سے بڑے آدمی کے گھر سے بلا تکلف مسند اور تکیہ منگوا لے، یہ مسند اور تکیہ علی العموم مخمل اور مشجر کا ہوتا تھا۔ لیکن اگر محلہ بھر میں موجود نہیں ہے اور کہیں سے میسر نہ آ سکا تو وہ یہ کہہ رہی ہے کہ ہماری یہ معمولی چیزیں بھی مخمل اور مشجر سے کم نہیں۔ کیونکہ ہم کو اعتراف ہے کہ تو یہ حق رکھتا ہے اور ہمارے دل میں تیری عزت کا یہ احساس موجود ہے۔ مگر ہم مجبور ہیں تو اس معمولی گودڑ کو بھی مخمل اور مشجر سمجھ۔

ماشاء اللہ سمجھدار ہو۔ تعلیم یافتہ ہو۔ مہذب ہو۔ ذرا بتاؤ تو سہی نور کے

مشرقی دلہنیں

بڑھیا سہیلیوں کی خط کتابت

سلمہ بہن! تمہارا حکم ٹالتی تو رہتی کہاں۔ بی نصیرہ کے ہاں گئی، اور سر آنکھوں سے گئی۔ مگر برا نہ ماننا شادی کیا ایک بیگار تھی، کہ کھیر جیسکی کر کر الگ کی، اور بیٹی کیا انگنائی کا کوڑا تھی، کہ جھاڑو دے دلا نکال باہر کیا۔ منگنی، مانیوں، جوڑا، چڑھاوا خاک بھی تو کچھ نہ ہوا۔ موئے غریب مفلس بھی تو بیٹی کا مان رکھ لیتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں کے آدمی، اتنے بڑے عزت دار، گاؤں، گوئیں، جائداد املاک، اللہ کا دیا سب کچھ، اور ایک بات ڈھنگ کی کرنی نصیب نہ ہوئی۔ جو رسم ہے وہ فضول، اور جو دستور ہے وہ غلط۔ جانتی ہوں کہ تم بھی آخر جنٹ صاحب ہی کی بہن ہو، اُن ہی کی سی کہو گی۔ مگر سلمہ منہ پر آئی نہیں رکتی۔ ایسی عقل بھی کس کام کی کہ تمام دنیا میں تھڑی تھڑی ہو جائے اور کان پر جوں نہ چلے۔ اللہ امین کی بیٹی اور داماد کو جوڑا تک نصیب نہیں۔ بتاؤ تو سہی ناک رہی یا کٹی؟ کیوں بیوی! جب مانیوں معیوب، ساچق گناہ، چوتھی کفر، جالے حرام تھے تو یہ پارٹی کہاں سے جائز ہو گئی۔ جب یہ روپے کا اٹھانا ہی فضول خرچی تھی تو یہاں

دھوپ کی زحمت سے محفوظ رہے گا۔

"نبی جی بھیجو۔ مدد اللہ کی"

ٹیں ٹیں ٹیں

عصمت سنہ ۱۹۲۰ء

وفا کا تاج

بہار کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ چاندنی رات اور ٹھنڈی ہوا دنیا والوں کے واسطے جنت کا نمونہ تھی۔ اُس رفیق کی یاد جو بیس سال ہمدم و غمگسار رہا آبادی سے قبرستان لے گئی۔ وہ آرام گاہ جس میں سلمان ہمیشہ کے واسطے میٹھی نیند لے رہا تھا آنکھ کے سامنے تھی۔ سرو کے پتے میٹھے اور سریلے سروں میں کہہ رہے تھے۔

"اے مٹی کو پوجنے والی بیگم! رشتۂ محبت ٹوٹ چکا۔ جا جا اور اِدھر کا رُخ نہ کر"

مشرق سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور یہ آواز سنائی دی۔

"حمیدہ" آسمانی فرشتے اور ہوائی چڑیاں تیرے گیت گا رہی ہیں۔ تیرے سر پر وہ تاج ہے جس میں خلوص اور وفا کے جواہرات قیامت تک جگمگاتے رہیں گے۔

(عصمت سنہ ۱۹۱۰ء)

ہیرے ہیں۔ سلمہ! ہمارے بڑے بیوقوف نہ تھے۔ جو باتیں مقرر کی ہیں ایسی جانچ تول اور کس پرکھ کر کہ جسوقت یہ بالکل نیست و نابود ہو جائیں گی۔ اُسوقت اُنکی قدر معلوم ہو گی۔

آج جبکہ آزادی کی ہوا ابھی نہیں جھکڑ چل رہے ہیں، مایُوں بٹھانا ظلم کیا جاتا ہے، مگر میں تو ہانکے پکارے کہتی ہوں کہ جو لڑکی چار دن میں میکے سے نکل کر سُسرال جانیوالی ہو اس کا باپ بھائیوں کے سامنے خوش خوش پھرنا اور جنہوں نے پال پوس کر اس لائق کیا ان کی جُدائی سے تیوری پر بل تک نہ لانا کیسی بُری بات ہے۔ اسی کا نام شرم و حیا ہے، کہ اسکے خیالات کا اظہار عام طور پر نہ ہو۔ رنگ نکھرنے اور خون بڑھنے کے لئے غیر معمولی خوراک اُبٹنے اور خوشبوؤں وغیرہ کا استعمال علی العلم کھلا کرتا بیچیائی نہیں تو بیحیائی کے سر پر کیا سینگ ہوتے ہیں۔ خیالات کے یکسو اور آنے والے وقت کے تمام نشیب فراز پر خوب اچھی طرح غور کر لینے اور ہر پہلو پر نظر ڈالنے کا تنہائی سے بہتر کوئی اور ذریعہ ہو سکتا ہو تو تم مجھے بتاؤ۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ دلہن کو سسرال میں جا کر جھکنے کی خاموش بیٹھنے کی گھٹنے کی عادت پڑ جائے۔

سلمہ! خدا کی قسم بڑی بڑی ہڑدنگیوں کے چہروں پر جو سارے سارے دن اور آدھی آدھی رات تک خاک اُڑاتی پھرتی تھیں کچھ ایسا نور برسنے لگتا تھا کہ غیروں کا دیکھ کر دل خوش ہو۔ خوشبو کی یہ کیفیت تھی کہ جدھر سے دُلہن نکل گئی گھر بھر مہک گیا۔ اب تو وہ شہاب اور کسوم سب غارت ہو گئے۔ بہت کیا انگریزی شیشی کھولی اور چھڑک لی۔ تمہارے اپنے جہیز کا اگر کوئی پھٹا پھٹا یا

کیوں صرف ہوا۔ یا وہاں روپیہ سونے کا تھا اور یہاں مٹی کا۔ رسموں سے بچتا تھا کہ رقم ضائع نہ ہو تو یہ انگریزی باجے، کل کی گاڑیاں، بجلی کی روشنی، کیا مفت آگئی تھی۔ کچھ بھی نہ ہوتا تو صبر آجاتا۔ شکوہ نہ شکایت، بدنامی نہ ذِلت، مگر اب تو ایک میں کیا دُنیا بھر یہی کہیگی کہ کیا اور کرنا نہ جانا۔ روپیہ کے متعلق تو بحث ہی نہیں۔ میں آپ کہتی ہوں جو بچے وہ اچھا، جو رہے وہ بہتر، مگر اس کا جواب کیا دیتی ہو، کہ نہ کیا جو کرنا تھا، اور کیا جو نہ کرنا تھا۔ انگریزی کا اثر ایسا چڑھا کہ اپنے ذاتی جوہر بھی کھو بیٹھے۔

آخر تم بھی تو غدر میں خاصی گیارہ بارہ برس کی تھیں۔ خود دُلہن بن چکی ہو، بیسیوں بنائیں، سینکڑوں دیکھیں۔ ایمان سے کہنا کیا وقت تھا، وہ جھکی جھکائی دبکی دبکائی دُلہنیں تو اب دیکھنے ہی میں نہیں آتیں۔ ایک یہیں کیا جدہر دیکھتی ہوں عالم ہی اور ہے۔ ایک وہ دن تھے برسوں بہو کی آواز کان میں نہ آتی تھی۔ ایک آج کا دن ہے کہ اِدھر بہو آئی اور اُدھر کھو لو میاں تقنع اور گھر سنبھالوں اپنا "عورت کا سب سے بڑا سلیقہ، سب سے اچھا زیور، سب سے بہتر جوہر، شرم و حیا ہے۔ بیوی یہ ہی وجہ تھی کہ اگلے لوگ دنوں بہو کا گھونگھٹ نہیں اُٹھاتے تھے۔ مہینوں کی بیاہی بھی سُکڑی سکڑائی اِدھر اُدھر ہولے ہولے پھرتی ہوئی اچھی دکھائی دیتی تھی۔ یہ تو معلوم ہوتا تھا کہ اِس گھر میں بہو آئی ہے۔ اب تو الٰہی توبہ، حقاقہ وتاقہ چیبر دِلو چار گھارو نو پانچ، تراق پڑاق، یہ جا وہ جا۔ غضب خدا کا چوتھی کی دُلہن دو دِن کی بیاہی اور بیٹھی میاں کے رومال پر نام لکھ رہی ہے۔

کچھ ایسا زمانہ پلٹا کہ وہ بات ہی نہ رہی تعجب تو یہ ہے کہ جن رسموں پر آج چاروں طرف سے لعن طعن اور لے دے ہو رہی ہے۔ ان میں بعض تو لیچڑ میں دبے ہوئے

پہلی بیویاں

ایسا تو کون ضدی ہو گا جس کو اِس میں کلام ہو کہ ہماری پچھلی حالت اور ابکی حالت میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ یا تو تعلیم نسواں کے نام سے مسلمان ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ یا اب جا بجا مدرسے شہر بہ شہر انجمنیں قائم ہو رہی ہیں رسالے بھی نکل رہے ہیں۔ اخبار بھی شائع ہو رہے ہیں۔ کلب بھی ہیں۔ سوسائٹیاں بھی ہیں۔ کتابیں بھی لکھی جا رہی ہیں۔ کورس بھی تیار ہو رہے ہیں۔ غرض علم کے جتنے ذریعے خیال میں آسکتے ہیں سب ہی سے کام لیا جا رہا ہے۔ اِن ہی باتوں کا نتیجہ اور اِن ہی کوششوں کا اثر ہے کہ لڑکیاں کچھ تھوڑی بہت پڑھی لکھی دکھائی دے رہی ہیں۔ پڑھنے کا اُنہیں چسکا لگ گیا ہے۔ وہ اپنے وقت کو کم ضائع کرتی ہیں۔ لیکن باوجود اِن سب باتوں کے جب ہم اگلی بیویوں سے آجکل کی بیویوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو چند ایسی باتیں اس وقت کی نظر آتی ہیں جنکا اب پتہ نہیں۔ اور اگر ٹرپی پڑائی بچی بچائی کہیں کچھ

اُدھر اُدھر ایا کپڑا پڑا ہو تو سونگھ کر دیکھو پچیس تیس برس کے بعد بھی اتنا پتہ دے رہا ہوگا کہ مجھے کسی دلہن کے زیب تن ہونے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔

اُن ہی وقتوں کی پلی پلائی ایک میں بھی ہوں۔ گو بڑھیا پھونس ہو گئی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ مگر جاہل ہوں یا بیوقوف یقین جاننا آجتک غیر مرد سے بات کرتے ہوئے جی ڈرتا ہے۔ میں مرنے کو تیار، آبا جان مرد ے سے بدتر، مگر خدا گواہ ہے اگر کبھی آنکھ ملا کر بات کی ہو۔ آجکل کی لڑکی بالیوں کو دیکھتی ہوں چولہے میں گیا پردہ، بھاڑ میں گیا لحاظ، رستہ میں فقیر ہے تو بلا سے، ڈیوڑھی پر نوکر بیٹھا ہے تو بیٹھنے دو۔ شُرک دیسی اُس گھر سے اِس گھر، اور اِس گھر سے اُس گھر۔ رونا بھی آتا ہے، ہنسی بھی آتی ہے بی زینب ماشاء اللہ یوں تو انگریزی اور فارسی سب میں طاق، جلسوں میں سب سے آگے، تہذیب میں سب سے اوّل، مگر پرسوں جو ماما بیمار پڑ گئی اور چاول پکانے اُٹھیں تو یہ تک خبر نہیں کہ پکا کر کھانڈ ڈالتے ہیں، یا یوں ہی۔ موا آں مُنہ پانی میں کھانڈ ڈال پتیلی کی پتیلی ہی غارت کی۔

ہماری تو خیر جس طرح گذرنی تھی گذر گئی۔ مگر اِس ننھی پود کا کیا ہوگا، جن کا دیدہ ابھی سے ہوائی ہو رہا ہے۔ خدا کی یہ نہیں، رسول کی یہ نہیں۔ ماں سے لگاؤ، نہ باپ سے تعلق، بڑوں کا ادب، نہ چھوٹوں کی محبت۔ غضب خدا کا، ٹانگ برابر کی لڑکی اور گز بھر کی زبان۔ جمیلہ کل ماں سے کہتی کیا ہے کہ "گڑیا میری تھی، آپ کو مجھ سے پوچھنے کا کیا حق حاصل ہے کہ کیا کی؟"

بس بوا سلمہ! چلنے کی تیاریاں کرو، اب دُنیا ہمارے رہنے کی جگہ نہیں۔ خدا عزت و آبرو سے اُٹھا لے تو سب کچھ بھر۔

عصمت ۱۹۱۰ء

اگلے اُصول موجودہ زمانہ کی رفتار کے موافق نہ سہی لیکن بعض ایسے ہیں کہ اگر وہ ہاتھ سے جاتے رہے تو گویا ہم نے جان کر اپنے تئیں ایسا نقصان پہنچایا جسکا کوئی معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ ہم تو اپنی اِس دُھن میں مست اپنا وقت پورا کر چل بسیں گے۔ لیکن وہ نسل جس کو ہمارے بعد دُنیا میں آنا اور جس کا اس سے بھی بدتر زمانہ سے پالا پڑنا ہے ہم کو کیا کہے گی؟

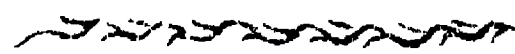
آجکل بعض لڑکیوں کا خیال ہے کہ قومی خدمات اور ہمدردی کا مادہ عورتوں میں ضرور ہونا چاہیے۔ اور جب تک تعلیم یافتہ نہ ہوں یہ عادت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اِس قسم کے مضامین میں نے پڑھے ہیں۔ جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ اگلی بیویاں جن کا علم شدھ بدھ تک محدود تھا۔ ہمدردی سے بالکل محروم تھیں۔ اگر کوئی لڑکی یہ سمجھتی ہے تو وہ محض غلطی پر ہے۔ وہ بیویاں جنکی بابت یہ خیال کیا جاتا ہو وہ دوسروں کے دُکھ درد میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ ناممکن تھا کہ مصیبت زدہ کی داستان سُنکر اُن کا کلیجہ نہ کٹ جائے۔ چاہے اُنپہ خود تکلیف گذر جائے مگر وہ اُسکی مدد ضرور کریں گی۔ گو زمانہ کی رفتار نے وہ ڈھنگ مٹا دئے۔ لیکن اب بھی اُن سرکاروں کے نام موجود ہیں جن سے رانڈوں، اپاہجوں، دکھیاریوں، مصیبت ماریوں کو تنخواہیں ملی ہیں۔ عصمت کی پڑھنے والی بیبیاں مجھے معاف کریں۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آجکل تو سب سے بڑا فرض ترقی کرنا ہے۔ جو شخص اِس فرض کو ادا نہیں کرتا وہ عقلمند نہیں ہے۔ لیکن اِس کا کیا جواب ہو کہ آجکل ترقی دُنیا میں وہی شخص کر سکتا ہے جو اپنی غرض کو دوسروں کی غرض پر مقدم سمجھے۔ وہ عورت جو اپنی مقررہ آمدنی میں سے

رہ بھی گئی ہیں تو روز بروز مٹتی جاتی ہیں۔ اور ایک وقت آئے گا کہ ہم میں اِن باتوں کا نام و نشان تک نہ رہے گا۔ لیکن کیا اچھا ہوتا اگر اس ترقی اور شوق ترقی کے ساتھ ہم اپنی اس وضع کو بھی ہاتھ سے نہ کھوتے۔ اور ہماری طرزِ معاشرت میں اگر بعض باتیں نئی ہوتیں تو بعض پُرانی بھی۔ ترقی کے یہ معنی تو شاید نہ ہونگے کہ ہم محض اِس دُھن میں ہیں کہ میڈمنٹن یا ٹینس وغیرہ کے شوق میں اپنی گڑیوں کو دیا سلائی دکھادیں۔ بلکہ میری رائے میں ترقی کا اصل منشا یہ ہے کہ اگر اب تک بچیاں گڑیا کے گھر میں چراغ جلایا کرتی تھیں تو اب لیمپ جلانا بھی سیکھ لیں۔ بعض بھائیوں اور بہنوں کی یہ کوشش ہے کہ ہماری پُرانی عادتیں چھوٹ جائیں۔ اور ہم آنکھ بند کر کے مغربی رنگ میں ڈوب جائیں۔ مگر وہ یقیناً غلطی پر ہیں۔ ہم لاکھ کوششیں کریں، عادتیں بدلیں، طریقے چھوڑیں، بالکل ہی مغربی کیوں نہ ہو جائیں، لیکن پھر بھی ہم سے یہ وضع نبھنی بہت مشکل ہے۔ ہماری مالی حالت ہرگز اس قابل نہیں کہ ہم انکا ساتھ دے سکیں۔ ہم اِن ہی جیسے کیوں نہ ہو جائیں پھر بھی حکمراں نہیں ہو سکتے۔ کہ روپیہ کی ریل پیل ہو جائے۔ ہمیں اگر ضرورت ہے تو یہ کہ ہم مغرب کے وہ طریقے جو ہم اچھی طرح نباہ سکیں اور جو درحقیقت مفید بھی ہیں۔ اور جن سے بہتر اسی قسم کے طریقے ہمارے ہاں نہیں ہیں اختیار کر لیں، لیکن یہ ضرورت نہیں کہ گرمی میں دوپٹوں کو خیرباد کہیں، اور جاڑوں میں لحاف کے بدلے کمبل لازمی سمجھ لیں۔

جس طرح ہر انسان کی ہر عادت ہر شخص کی نگاہ میں اچھی نہیں معلوم ہو سکتی، اسی طرح کوئی ملک، یا کوئی قوم جس کے تمام طریقے مقبول ہوں۔ ہمارے بعض

اب یہ باتیں معیوب ہیں۔ اُٹھ گئیں اور اٹھ رہی ہیں۔ آج جواب یہ ہوگا کہ
نہایت بے غیرت عورت ہے۔ اُسکو مانگنے کا حق کیا حاصل ہے"
مشکل کیا ناممکن تھا کہ دلچسپ سے دلچسپ مشغلہ بھی اُن کی نماز میں رخنہ
ڈالدے۔ تلاوت قرآن اُن کا ضروری کام تھا۔ اور جب کاروبار سے فراغت پا
بچھونوں پر سونے لیٹتی تھیں اُس وقت تک اپنے عزیزوں کو پڑھ پڑھ کر
پہنچانا اُن کا فرض تھا۔ مذہب کے اعتبار سے اُنکا یہ خیال صحیح ہو یا غلط، لیکن
اگر غلط بھی تھا تو کیا اچھا غلط کام تھا۔
ان کے آگے دو چھوڑ چار مامائیں ہوں مگر وہ ان کی محتاج نہ تھیں۔
اُن کو یہ وقت پیش نہ آتی تھی کہ آج ماما کو دیر ہوگئی تو بچے بھوکے مدرسے
چلے گئے۔ اور میاں آدھا پیٹ کھا کچہری رخصت ہوتے۔ ان کی دسوں انگلیاں
دسوں چراغ تھیں۔ وہ اچھے سے اچھا پکا سکتی تھیں۔ اور بہتر سے بہتر
سی سکتی تھیں۔

عصمت ۱۹۱۱ء



مفلس رشتہ داروں، حاجتمند پڑوسیوں کی خدمت لازمی سمجھتی ہے، وہ نہ روپیہ بچا سکتی ہے۔ نہ جوڑ سکتی ہے۔ نہ مالدار ہو گی۔ نہ معزز سمجھی جائے گی۔

اگلی بیویاں خدا انہیں غریق رحمت کرے کفایت شعاری اپنا فرضِ منصبی سمجھتی تھیں۔ جو آ گیا وہ کھا لیا۔ جو مل گیا وہ پہن لیا۔ لیکن وقت پر نہ انکو کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا۔ نہ ذلت اُٹھانی پڑتی تھی۔

بیٹی کا بیاہ ہے، خرچ سر پر ہے۔ میاں پریشان ہے کہ کہاں سے لاؤں۔ بیوی کے پاس جو کچھ جمع جتھا ہوئی اُس نے نکال سامنے رکھدی۔ میاں کا دل باغ باغ ہو گیا۔ پریشانی کا بڑا حصّہ محض بیوی کی کفایت شعاری سے رفع ہو گیا۔ آجکل ضرورت یہ ہے کہ کلب میں کسی بیوی سے کپڑے کم نہ ہوں۔ اور جو کہیں میلے ہوئے تو مِس صاحب گھسنے کب دینگی۔ غرض بڑی رقم تو بیوی کے کپڑوں ہی میں صرف ہو گئی۔ چاہے میاں کی اچکن تین برس کی ہو۔ مگر بیوی کے پونہچے پر گھڑی ضرور ہو گی۔

مرنے والیاں کہتی تھیں "حق ہمسایہ ما کا جایا" بہت مشکل تھا کہ پڑوس میں فاقہ ہو اور وہ آپ اطمینان سے کھانا کھائیں۔ ان کے تعلقات، ان کا میل جول، ان غریبوں کے ساتھ ایسا تھا کہ آج اپنوں میں وہ بات نظر نہیں آتی۔ کچھ تو تھا جس کا یہ نتیجہ تھا کہ کھانا نکالنے بیٹھیں، میاں کو دیا، بچوں کو دیا، آنکھ اُٹھا کر دیکھتی ہیں تو ہمسائی کی لڑکی تتلا کر کہہ رہی ہے "اُستانجی اماں نے ذری سا سالن مانگا ہے۔ بھائی کی روٹی رو کھی ہے"۔

میں نے اُن کے بہت سے سوالوں کا جواب تو دیدیا، مگر اِس خیال کے متعلق عرض کیا۔ کہ اپنی رائے عِصمت میں ظاہر کروں گا چنانچہ اُن کے سوال کا جواب دیتا ہوں۔

میں حقوقِ نسواں کا حامی ضرور ہوں، اور چاہتا ہوں۔ کہ جو حقوق شرعِ اسلام نے عورتوں کو عطا فرمائے ہیں، وہ مسلمان نہایت فراخ دلی سے اپنی عورتوں کو دیدیں۔ جن گھروں میں بیویاں واقعی گھر کی ملکہ ہیں، خدا اُنکے شوہروں پر رحمت و برکت نازل کرے گا۔ مگر میں چونکہ خود بدترین مخلوق ہوں، اِس لئے میری نظر سے وہی بیچاریاں گذرتی ہیں، جو عطیۂ اسلام سے محروم کردی گئیں۔ اِس لئے میرا فرض ہے، کہ میں جب تک زندہ ہوں، ان کے حقوق کی فریاد مردوں کے کان تک پہنچاؤں۔ اِس سلسلہ میں اخباروں سے، رسالوں سے، مضمونوں سے، کتابوں سے، غرض جس طرح بھی ہوگا جب تک دماغ کام کر رہا ہے، یہ صدا بلند کرتا رہوں گا۔

میں یقیناً تعلیمِ نسواں کا ساعی ہوں، اور عِصمت اسی مقصد کیلئے آج قریب قریب دس سال سے جاری ہے۔ لیکن حاشا وکلّا میں اس تعلیم کا ساعی نہیں جو آج کل تعلیم سمجھی جا رہی ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا، کہ مسلمان لڑکیاں تعلیم کے واسطے غیر مسلموں کے سپرد کردی جائیں، میں اس خاص معاملہ میں یہاں تک متعصب ہوں کہ میں یہ بھی روا نہ رکھوں گا۔ کہ لڑکیاں ایک لمحہ کے واسطے بھی والدین یا سرپرستوں کی آنکھ سے اوجھل ہوں۔ اگر دوسرے ناظرینِ عِصمت کا بھی یہ خیال ہے، کہ میں موجودہ طریقۂ تعلیم کو

جاہل بیویوں کی ایک جھلک

کل ایک صاحب جو عصمت کے قدیمی خریدار ہیں۔ معہ اپنی بیوی کے مجھ سے ملنے تشریف لائے۔ میاں معزز عہدہ دار، بیوی تعلیم یافتہ، تمدن جدید رگ رگ میں بھرا ہوا تھا، دو ڈھائی گھنٹہ تک بیٹھے رہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ قدامت سے متنفر، جدّت کے شیدا، تعلیم نسواں کے عاشق، پردہ پر معترض، یہ سمجھ کر کہ میں بھی حقوق نسواں کا حامی، اور تعلیم نسواں کا ساعی ہوں، اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے۔ منجملہ دوسری باتوں کے دوران گفتگو میں یہ بھی فرمایا۔ کہ

"آپ جیسے بزرگ کی کوشش سے لڑکیاں قید جہالت سے آزاد ہوگئیں، وہ اپنے فرائض کو سمجھنے لگیں، پرانے گڑھوں سے نکل کر علم کے سایہ میں آگئیں، تعجب ہوتا ہے، کہ کس طرح اگلی عورتیں زندگی بسر کرتی تھیں؟"

پڑھتی ہوئی بستر راحت سے اُٹھ بیٹھیں۔ اُن کی زندگی کا پہلا کام خدائے برتر کے حضور میں سجدہ تھا۔ عاجزی کے آنسوؤں سے رو کر، خلوص کی تمناؤں سے بلک کر اور محبت بھرے دل سے گڑگڑا کر دعا مانگی۔

"الٰہ العالمین اپنے حبیب کا طفیل یہ صبح اطمینان سے شام۔ اور یہ دن عزت و آبرو سے بسر ہو۔ بچوں کی عمر میں برکت۔ اِن کے باپ کی عزت میں ترقی، ہاتھ پاؤں میں قوت، گھر پر رحمت، گھر والوں پر تیری عنایت، الٰہی گناہوں کو بخش، دنیا میں سرخرو رکھ، عاقبت میں رحم کر۔"

نماز پڑھی، کلام اللہ پڑھا۔ ماما موجود تھی۔ مگر باورچی خانہ میں جا گھسیں۔ کیوں، اِس خیال سے کہ کھانے میں خرابی اور پکانے میں نقص نہ رہ جائے، وقت سے پہلے تیار اور ضرورت سے قبل موجود، اِن کی ہر ادا پر، اِن کے ہر کام پر، اِن کے ہر خیال پر، اِن کی ہر کوشش پر، دنیائے نسواں مرحبا کے نعرے لگا رہی ہے۔ کھانا کھلا چکیں میاں کو، بچوں کو، نوکروں کو، ماما کو، نوکروں کو اسی پر بس نہیں، اس مسجد کے موذن کو جس کی اذان کان میں آتی ہے۔ اس رانڈ کو جو دیوار بیچ رہتی ہے، اُن یتیموں کو جو اس مکان کے سایہ میں سوتے ہیں۔ کھلا کر اور پلا کر، دے کر اور دلا کر، آپ خود کھانے بیٹھتی ہیں۔ اتفاق سے سالن نہیں بچا، چٹنی پسوائی، مٹکے میں سے اچار نکالا۔ اور پتیلی پونچھ کر روٹی کھا، پہلے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد پانی پیا۔ یہ مسلمان گھروں کی حوریں ہیں۔ اِن کی صورت پر، ان کی حالت پر، ان کی زندگی پر، اِن کے تمدن پر، زمین کی کائنات، آسمان کے فرشتے فخر کر رہے۔ ان کے ہاتھ میں یہ روکھی

جائز سمجھتا ہوں، تو یہ اُن کی غلطی ہے۔

یہ ناقص تعلیم جس قدر قابلِ اعتراض ہو سکتی ہے، اس سے زیادہ وہ ذرائع قابلِ اعتراض ہیں، جو تعلیم کے واسطے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ موجودہ تعلیم چونکہ مذہب سے علیحدہ ہے۔ اِس لئے اس کا پرچھاواں بھی مسلمان عورتوں کے واسطے سمِ قاتل ہے۔

ضرورت یہ ہے کہ ان کو جو کچھ پڑھایا لکھایا جائے، وہ سب دائرۂ مذہب کے اندر۔ دس پانچ، یا سو پچاس خاص خاص لڑکیوں کو چھوڑ کر عام طور پر وہ لڑکیاں جو تعلیم یافتہ سمجھی جا رہی ہیں، ان کی قابلیت صرف اتنی ہے، کہ ٹوٹا پھوٹا خط یا غلط سلط مضمون لکھ لیں۔ اخبار اور رسالے پڑھ لیں، کتابیں دیکھ لیں، لیکن اس قابل ہونے کے واسطے سب سے پہلے موجودہ طریقۂ تعلیم کے سلسلہ میں ان کو مذہب کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ اِس لئے یہ سودا کسی اعتبار سے قابلِ توجہ نہیں۔ اگلی بیویاں جو جاہل اور پھوہڑ سمجھی جاتی ہیں، ان سے بہت زیادہ پڑھی لکھی ہوتی تھیں۔ اور سب سے بڑا جوہر جو مذہب تھا۔ وہ ان کے واسطے مایۂ ناز ہوتا تھا۔

اگر تمدنِ جدید کی ظاہری خوبیاں جو پانی کے بلبلوں سے زیادہ پائدار نہیں فرصت دیں، تو آؤ میرے ساتھ آؤ۔ اشتیاق کی آنکھوں سے دیکھو حُسنِ عقیدت کے قدم اُٹھاؤ۔ میں تم کو آج سے پچاس برس پہلے کا ایک گھر دکھاؤں۔ دیکھو یہ گھر والی بیوی باورچی خانہ میں بیٹھی ہیں، ان کے پاس گھڑی گھنٹہ نہ تھا۔ مگر تاروں نے جھلملا کر اُن کو آمدِ صبح کا پیغام پہونچایا۔ اور یہ کلمۂ توحید

کہانیاں سُنائیں۔ دُنیا کے نشیب و فراز بتاتے۔ خدا کی عظمت، اسلام کی وقعت اور رسول کی محبت کا دل پر سکّہ بٹھادیا۔

تم نے یہ گھر دیکھ لیئے، اور گھر والیاں بھی۔ ان کو جاہل اور پھوہڑ کہتے ہو۔ گریبان میں منہ ڈالو۔ اور دیکھو انصاف کیا کہتا ہے۔ یہ خدا کی بہترین مخلوق ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں خلق و محبت کے ایسے دریا بہائے کہ اب تک اُن کا فیض جاری ہے۔ ان کے مُبارک ہاتھ چمنستانِ حیات میں وہ پھول کھلا گئے ہیں جو مدتوں خلق اللہ کے دماغ معطر رکھیں گے۔ ادب کے ہاتھ اٹھاکر ان ماؤں کو سلام کرو۔ تعظیم کی آنکھیں جھکادو۔ اور کہو۔

جنتی بیویوں، چراغ اسلام تمہارے دم سے روشن تھا۔ تعلیم نسواں کا جو خاکہ تم پیش کر گئیں جب تک مسلمان اس کو سر آنکھوں پہ نہ رکھیں گے ترقی نہیں کر سکتے۔

عصمت سنہ ۱۹۱۸ء

روٹی نہیں ہے۔ یہ وہ سدا بہار پھول ہیں، جو ان کی زندگی کو ہمیشہ مہکائیں گے۔

کھانے سے فارغ ہو کر میاں روٹی کمانے گئے۔ اُنہوں نے سینے پرونے کی بقچیاں کھولیں۔ ان کپڑوں کو غور سے دیکھ لو۔ اور ان کی کڑھائیوں کو آنکھ سے لگاؤ۔ یہ سلائی اور کڑھت ان کے ساتھ ختم ہو گی۔ یہ کیریاں اور بوٹیاں اگر دورِ ترقی میں کبھی نظر بھی آئیں گی تو مغلانیوں اور سلائی والیوں کے طفیل۔ نمازِ ظہر پڑھ محلہ کی ان چار پانچ لڑکیوں کو جو غریب و مفلس ہیں سبق دیں گی۔ پہلے کلام اللہ۔ پھر اُردو فارسی۔ اس کے بعد لکھنا اور حساب۔

اب ایک بات اور سمجھ لو، ان کے تعلیمی وظیفے خوشی کے ساتھ جاری ہیں۔ نہ اعلان کی ضرورت، نہ طلبی کی خواہش۔ کھِلاتی ہیں اور پڑھاتی ہیں۔ پہناتی ہیں اور لکھواتی ہیں۔

عصر کا وقت قریب ہے، میاں کے آنے کا وقت بھی ہو گیا، بچے بھی مدرسہ سے آ رہے ہیں۔ کھانے کی تیاری میں مصروف ہوئیں۔

ذرا اس کمرہ کو بھی دیکھ لو جھاڑو دے دلا کر چندن کر دیا۔ میز کرسیاں تو نہیں ہیں، مگر دری پر چاندنی بچھی ہے۔ پلنگ پر چادریں کسی ہوئی ہیں۔ اُجلے برتن۔ پاک و صاف انگنائی، جہاں صحت کے اعتبار سے بھی غور کر لو۔ تم کو ایک بات خلاف نہ معلوم ہو گی۔

رات ہو گئی، عِشا کی نماز سے فراغت پا بچوں کو لے کر بچھونے میں لیٹیں۔

کہانیاں سُنائیں۔ دُنیا کے نشیب و فراز بتائے۔ خدا کی عظمت، اسلام کی وقعت اور رسول کی محبت کا دل پر سکہ بٹھا دیا۔

تم نے یہ گھر دیکھ لیے، اور گھر والیاں بھی۔ ان کو جاہل اور پھوہڑ کہتے ہو۔ گریبان میں منہ ڈالو۔ اور دیکھو انصاف کیا کہتا ہے۔ یہ خدا کی بہترین مخلوق ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں خلق و محبت کے ایسے دریا بہائے کہ اب تک اُن کا فیض جاری ہے۔ ان کے مُبارک ہاتھ چمنستانِ حیات میں وہ پھول کھِلا گئے ہیں جو مدتوں خلق اللہ کے دماغ معطر رکھیں گے۔ ادب کے ہاتھ اٹھا کر ان ماؤں کو سلام کرو۔ تعظیم کی آنکھیں جھکا دو۔ اور کہو۔

جنتی بیویوں، چراغ اسلام تمہارے دم سے روشن تھا۔ تعلیم نسواں کل جو خاکہ تم پیش کر گئیں جب تک مُسلمان اس کو سر آنکھوں پر نہ رکھیں گے ترقی نہیں کر سکتے۔

...

عصمت ۱۹۱۸ء

روٹی نہیں ہے۔ یہ وہ سدا بہار پھول ہیں، جو ان کی زندگی کو ہمیشہ مہکائیں گے۔

کھانے سے فارغ ہو کر میاں روٹی کمانے گئے۔ انہوں نے سینے پرونے کی بقچیاں کھولیں۔ ان کپڑوں کو غور سے دیکھ لو۔ اور ان کی کڑھائیوں کو آنکھ سے لگاؤ۔ یہ سلائی اور کڑھت ان کے ساتھ ختم ہو گی۔ یہ کیریاں اور بوٹیاں اگر دورِ ترقی میں کبھی نظر بھی آئیں گی تو مغلانیوں اور سلائی والیوں کے طفیل۔ نماز ظہر پڑھ محلہ کی ان چار پانچ لڑکیوں کو جو غریب و مفلس ہیں سبق دیں گی۔ پہلے کلام اللہ۔ پھر اردو فارسی۔ اس کے بعد لکھنا اور حساب۔

اب ایک بات اور سمجھ لو، ان کے تعلیمی وظیفے خوشی کے ساتھ جاری ہیں۔ نہ اعلان کی ضرورت، نہ طلبی کی خواہش۔ کھلاتی ہیں اور پڑھاتی ہیں۔ پہناتی ہیں اور لکھواتی ہیں۔

عصر کا وقت قریب ہے، میاں کے آنے کا وقت بھی ہو گیا، بچے بھی مدرسہ سے آرہے ہیں۔ کھانے کی تیاری میں مصروف ہوئیں۔

ذرا اس کمرہ کو بھی دیکھ لو جھاڑ دے دلا کر چندن کر دیا۔ میز کرسیاں تو نہیں ہیں، مگر دری پر چاندنی بچھی ہے۔ پلنگ پر چادریں کسی ہوئی ہیں۔ اُجلے برتن۔ پاک و صاف انگنائی، جہاں صحت کے اعتبار سے بھی غور کر لو۔ تم کو ایک بات خلاف نہ معلوم ہو گی۔

رات ہو گئی، عشا کی نماز سے فراغت پا بچوں کو لے کر بچھونے میں لیٹیں۔

رہا تھا۔ اور جس کی سریلی تانیں دلوں کو مسخر کر رہی تھیں، اس سنسان منزل میں خاموش ہے۔ تو حیرت کا ابرِ سیاہ اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ درختوں کے پتے، زمین کی گھاس، اور ہوا کے ذرّے یادِ رفتگاں میں رنج کے آنسو برسا رہے ہیں، عالمِ اسلام کی جگر دوز آہیں بلند ہو ہو کر فلکِ نیلگوں تک پہونچتی ہیں اور دھواں دھار گھٹا بنکر مٹی کے ڈھیروں پر برستی ہیں۔

تعجب کی زنجیریں اس کا پاؤں پکڑ لیتی ہیں، اور وہ انگشت بدنداں ہر سمت دیکھتا ہے کہ دفعتاً طوطیِ خوش الحان کا نالہ اسکے کان میں پہنچا ہے۔ وہ سنتا ہے کہ

"کیا تھا کیا ہو گیا"

چلتا ہے اور سوچتا ہے، بڑھتا ہے اور رکتا ہے، پیہم نالے اس کے حواس باختہ کر دیتے ہیں، کہ ایک صدا اس سناٹے میں گونجتی ہے۔

"نو وارد سیاح جس خاک کو روندر رہا ہے، یہ وہ مبارک ہڈیاں ہیں جو اسلام کے چراغ روشن کر گئیں۔ یہ مسلم خواتین کے اس طبقہ کی آرام گاہ ہے جس کے نام پر خلوص قربان ہوا، جس کے قدموں پر ایثار نے سجدے کئے۔ ان کی زندگی نے وہ کام کئے ہیں کہ دیکھنے والی آنکھیں اُن کی جدائی پر خون کے آنسو گرائیں گی، تڑپیں گی، اور روئیں گی، چیخیں گی اور بلبلائیں گی، مگر چشمِ دنیا ان کا نعم البدل نہ دیکھے گی۔

جانتے ہو یہ مٹی کے ڈھیر کا ٹوٹا ہوا کتبہ جس پر الّو کی بیٹیاں ٹکریں مار رہی ہیں کس کا مرثیہ پڑھ رہا ہے، تم نے فاختہ کی کو کو سنی۔ یہ اُسی جنتی بیوی کے واقعات دوہرا رہی ہے جس کے سرہانے بیٹھی گریہ کناں ہے۔

جنّتی بیوی کا ایک دن

بلبلِ قلم چمنستانِ تاریخ میں چہکتا ہوا جب اس شاداب قطعہ میں پہنچتا ہے جہاں خواتین اسلام گلہائے رنگین کے تحفے دونوں ہاتھوں میں لئے بساطِ اسلام کو معطر کر رہی ہیں تو دنگ سا رہ جاتا ہے۔ اس کی زمزمہ پردازیاں ساکت ہوتی ہیں، اور خاموشی کا قفل نوا سنجیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ قابلِ قدر ہستیاں اپنے زرّیں اعمال اور بیش بہا اقوال سے اسی فانی دنیا کی انصاف پسند نگاہوں میں آن و وقار پیدا کر چکی ہیں کہ حقیقت شناس مردوں کی سربلند گردنیں اُن کی شرمگیں نگاہوں کے روبرو خم ہیں، وہ گھر کی با اختیار ملکہ ہیں، بچّوں کے بے مثل اتالیق ان کے قیاس درست، ان کی رائے صائب، ان کے عقائد پکے، ان کا مذہب صحیح۔

دورِ حاضرہ کا متجسس سیاح جب آبادی سے سیر ہو کر ویرانہ کا رُخ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہی طوطی خوش الحان جو شہر کی چہل پہل میں بآوازِ بلند چہک

خاموش رہی، مگر دولت قدر سے لبریز آنکھیں شیدائے مذہب بیوی کے استقبال کو جھکیں، دِل ہی دل میں جزاک اللہ اور مرحبا کہتا ہوا آگے بڑھا تو ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں، صابون اور برش نہ تھا، مگر منجن مسواک تیار تھی، شوہر کو مسجد میں بھیج جنتی بیوی یادِ خدا میں مصروف ہوئی۔

ذرا احساس فرائض پر نظر ڈالنا اس کے دونوں ہاتھ کیسے سدا بہار پھولوں سے مزین ہیں، اگر ایک ہاتھ کی مٹھی دُنیا کے فانی گلیوں سے لبریز ہے، تو دوسرے ہاتھ میں دین کے وہ خوشبودار گجرے سو رہے ہیں جس کی ہر پتی بقائے دوام سے مالامال ہے۔

طلوع آفتاب سے قبل کہ بچے بیدار اور شوہر وظائف سے فارغ ہو، ناشتہ تیار ہے۔ لیکن چاء اور بسکٹ نہیں۔ توس اور مکھن نہیں۔ مونگ کی کھچڑی اور روغنی ٹکیاں، خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ عقیدہ اچھا تھا یا بُرا کہ اس ناشتہ میں ایک حصہ اس کا بھی تھا جس نے یہ نعمت عطا فرمائی، اور بچوں کے ساتھ کبھی محلہ کی یتیم بچی شریک ہوئی اور کبھی مسجد کا نابینا مؤذن۔

عالم اسلام آج ان نسوانی ہستیوں سے محروم ہے، بدتر تھیں یا بہتر، مگر ایسی تھیں کہ ان کی یاد آجتک زندہ دلوں کو تڑپا رہی ہے۔ ان کا تذکرہ ابتک زبانوں پر موجود ہے۔ اور دیکھنے والی آنکھیں عالم خیال میں اس وقت تک انکی فانی صورتوں کی پرستش کر رہی ہیں۔

لو آنکھیں کھولو اور مساوات اسلامی کا سبق ان سے سیکھو، تم نے قرن اولٰے کے واقعات پڑھے اور سُنے یہ دیکھو اور روؤ، کھانے سے فارغ ہونیکے بعد

سُنو اور دیکھو، سمجھو اور پڑھو، یہ اس کی کتاب زندگی کا ایک ورق ہے، اس کے روزنامچہ کا ایک صفحہ اور عمر ناپائیدار کا ایک دن۔

شبِ سرما کا تسلط ہر سمت پوری طرح جما ہوا تھا، مرغ اور مؤذن دونوں بے خبر تھے، کہ یہ بیگم رسول عربی کی نبوت کا اقرار کرتی ہوئی بستر استراحت سے اُٹھی اس کا دل و دماغ دونوں توحید و رسالت کی قوت و محبت سے ہراساں اور لبریز تھے پانی گرم کیا، وضو کیا، کہ ہوا نے ایک سمت سے صدائے توحید اُس کے کان میں پہنچائی موجودہ دُنیا اگر وہ سماں دیکھنا چاہتی ہے تو ان بیویوں کو قبر سے اُٹھا لائے، وقت یہ ہے کہ زلف شب کا جال دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اور حالت یہ کہ ایک مسلمان عورت جو ہر لحہ یقین موت سے وابستہ ہے خدائے برتر کے حضور میں حاضر ہونے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ یہ وہ ساعت ہے کہ عظمت باری تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا خیال کا گذر اس کے قلب میں نہیں۔ وہ ہوا سے بلند ہونے والی آواز کے یہ الفاظ سنتی ہے "نماز نیند سے بہتر ہے" ذرا اس کا یقین، اس کا ایمان اس کا اسلام دیکھو، اس کا دل کانپتا ہے، ہاتھ پاؤں تھرّاتے ہیں، اسکی آنکھیں غلبہ خوف سے سجدے کے واسطے اوپر اُٹھتی ہیں۔ وہ دیکھتی ہے کہ فضاء آسمانی کا ہر ذرّہ شہنشاہ حقیقی کا گیت گا رہا ہے۔ تاروں کی سہانی چاندنی کی روشنی، رات کا اندھیرا سب دم توڑ رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں اس کا سر اعتراف حقیقت پر جھک جاتے ہیں۔ اور وہ بآواز بلند یہ کہتی ہوئی شوہر کو جگاتی ہے "الصَّلوٰۃ خیرٌ من النوم"۔

حُسن عقیدت کے گلہائے رنگین سے آراستہ و پیراستہ شوہر کلمہ توحید پڑھتا ہوا بستر استراحت سے اُٹھا تو ابھی صدائے حق فضاء آسمانی میں گونج رہی تھی، زبان

"ہزاروں من مٹی کے نیچے سونے والی بیویو! تمہاری جہالت پر آج کی تعلیم قربان! مسجدیں تمہارے دم سے اور مدرسے تمہارے کرم سے آباد تھے، آج خانقاہیں سُنسان اور مدرسے ویران ہیں! تم ہم کو دکھا گئیں کہ مسلمان عورت کی زندگی کا مقصد کیا ہے، خدا تم پر اپنی رحمت نازل کرے۔

محترم ماؤں دعا کرو کہ قوم میں پھر تم جیسی بیویاں پیدا ہوں، جن کی پاک ہستیاں عالمِ اسلام کو جگمگا دیں۔"

عصمت ۱۹۲۲ء

مگر کیسی فراغت، سب کو کھلا کر خود کھانے بیٹھتی ہے، کہ محلہ کی ایک عورت پھٹا برقع، زدہ حال، آبیٹھی اور اپنی مصیبت سُنانی شروع کی، یہ غیر نہیں جان پہچان ہے۔ بیگم اس کے حال سے واقف اور مصیبت سے آشنا ہی۔ اس کے آتے ہی ہمدردی کی آنکھوں سے اس کا استقبال کیا، اور محبت کے ہاتھ اسکے لینے کو آگے بڑھائے، اصرار کیا، منت کی، خوشامد کی، دیکھو دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ بیگم اور فقیرنی دونوں ایک دسترخوان پر کھانا کھا رہے ہیں!

کہو! کیا دیکھا، کیا آیندہ بھی یہ منظر دیکھو گے؟

ماما موجود تھی، مگر اس لئے نہیں کہ بیگم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتی، وقت مقررہ سے پہلے شوہر اور بچوّں کو کھانا دیا۔ کہ ماما کی سُستی اپنی ذمہ داری پر حرف نہ لے آئے، دس بجے سے بچیوں کو پڑھانے بیٹھی، سبق کلام اللہ کا تھا، مجال نہ تھی کہ کوئی بچّی زیر زبر تک کی غلطی کر جائے، ادہر توپ چلی بارہ بجے، ادہر اُس نے کہا "بس زوال کا وقت ہے، قرآن شریف رکھدو اور سوئی دھاگہ لو"

تمدن اسلام سے یہ ایسا سماں درہم برہم ہو گیا، کہ موجودہ معاشرت عمر بھر سر دھنے گی اور یہ رنگ نصیب نہ ہو گا۔ اُنہوں نے بساط زندگی پر جو افشاں کی ہے وہ ایسی پائدار ہے کہ تاریخ اس کو دیکھکر عش عش کر رہی ہے۔ بلبل قلم چہکتا ہوا جب اس جگہ پہنچا ہے کہ عالم اسلام پر حکومت کرنے والیاں قبروں میں آرام کر رہی ہیں، تو اس کا نالہ قبرستان کو سر پر اُٹھا لیتا ہے، وہ روتا ہے اور کہتا ہے۔

تہذیب کے خیالات سے باوجود کوشش کے متفق نہ ہوسکا۔ افسوس ہے کہ میرے سامنے اِس وقت تہذیب کا وہ پرچہ نہیں ہے۔ مگر میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔

قدرت نے یہ نظام قائم کیا ہے کہ ہر موسم میں زمین کی پیداوار آب و ہوا کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ تربوز ٹھیٹ گرمی میں ہوتا ہے جس وقت لو کے جھکڑ چلتے ہیں۔ اور انسان پسینہ پسینہ ہوتا ہے۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑتے ہیں۔ اس وقت تربوز کا ایک قتلہ یا شربت کا ایک کٹورا عجیب تسکین و فرحت بخشتا ہے۔ لیکن یہی تربوز اگر جاڑوں میں پیدا ہوتا تو بجاتے ایک کٹورے کے آدھا کٹورا بھی حلق سے نہ اُترنے پاتا۔ اور پینے والا نمونیہ میں مبتلا ہو جاتا۔

زمین کی تمام پیداوار کا قریب قریب یہی حال ہے اور یہ نظام عالم ہے۔ اِسی طرح زمانہ کی رفتار انسان کو اپنے سانچے میں ڈھال کر ہموار کر لیتی ہے۔ حامد بیگم صاحبہ نے جن بیویوں کو پیش کیا ہے۔ اُس وقت کا مطالبہ وہی تھا۔ مگر آج وقت کا مطالبہ کچھ اور ہے۔ اِس لئے جن لڑکیوں کی ضرورت موجودہ زمانے کو ہے اِسی قِسم کی لڑکیاں پیدا ہونی چاہئیں۔

نامہ نگار تہذیب نے اگلی بیویوں کے متعلق رائے قائم کرنے میں بہت عجلت سے کام لیا ہے۔ یہ خیال کہ وہ ختنہ وغیرہ کے مراسم میں روپیہ زیادہ صرف کرتی تھیں حقیقت کے موافق نہیں۔ وہ جتنی چادر دیکھتی تھیں اُتنے ہی پاؤں پھیلاتی تھیں۔ اور آج سے نصف صدی پیشتر کا کوئی شریف مسلمان گھر ایسا نہ ہوتا تھا جہاں گھر کی بڑی بوڑھی کے پاس وقت بے وقت کے واسطے

عورتوں کی تعلیم اور جہالت

اکتوبر کے رسالہ عصمت میں محترمہ سلطان بیگم صاحبہ نے تعلیم نسواں کے متعلق مجھ سے چند سوالات کئے تھے۔ جس کا جواب میں جنوری کے پرچہ میں دے چکا ہوں۔ اب عزیزہ حامدہ بیگم صاحبہ نے تہذیب نسواں میں اسی قسم کا ایک مضمون بعنوان تعلیم نسواں لکھا ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے۔ کہ آج سے نصف صدی پیشتر کی خواتین۔ خانہ داری کے اکثر معاملات سے باخبر تھیں۔ اور جو ہنر آج تعلیم کے ذریعہ سے عورتوں میں پیدا کئے جا رہے ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر پچھلی بیویوں میں موجود تھے۔ مگر باوجود اس کے وہ جاہل کہی جاتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس مضمون میں حامدہ بیگم صاحبہ نے جواب کے واسطے مجھے بھی مخاطب کیا ہے۔ اور تہذیب میں کسی صاحب نے اس کا جواب بھی لکھا ہے۔ میں حامدہ بیگم صاحبہ کے خیالات سے ایک بڑی حد تک متفق ہوں۔ اور نامہ نگارِ

خیال ہے کہ عورتیں اس میں بھی کم نہ ہوں گی۔ تین چار سال ہوئے ایک لڑکی انٹرنس کا امتحان دینے دہلی آئی۔ اور دفتر عصمت ہی میں ٹھیری۔ اس نے یہاں پہونچکر پہلا کام یہ کیا۔ کہ اپنے پیر کا تعویذ لیا۔ پھر امتحان میں شریک ہوئی۔

حامدہ بیگم صاحبہ نے جو یہ بحث چھیڑی ہے وہ بہت طویل ہے۔ اور میں مرنے والی بیویوں کو اکثر اعتبار سے بہت اچھا سمجھتا ہوں۔ اور مجھے یہ دیکھکر دلی صدمہ ہوتا ہے کہ موجودہ تعلیم یافتہ لڑکیوں نے اپنی علالت کے مصارف کا ایک مستقل بار شوہر کی آمدنی پر ڈال رکھا ہے۔ اور وہ صرف اس لئے کہ ہل کر پانی بھی نہیں پیتیں اور ہر ضرورت کے واسطے ملازم رکھنا پڑتا ہے۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ مرنے والی بیویاں باوجود ماما اور باورچی ہونے کے گھر کا بہت سا کام خود کرتی تھیں۔ سالن ہر حال میں خود ہی پکاتی تھیں محنت سے جی نہ چراتی تھیں۔ اور یہی ان کی ورزش تھی مہمان کے سامنے اپنی ذمہ داری اور شوہر کی عزت کو پیش نظر رکھتی تھیں۔ اور شوہر کو کھانے کی میز پر یہ نہ کہنا پڑتا تھا کہ

"افسوس باورچی کی غلطی سے شامی کبابوں میں نمک زیادہ ہوگیا"

عصمت ۱۹۲۶ء

کچھ پس انداز نہ ہو۔ مگر آج مسلمانوں کی حالت بالکل اِس کے برخلاف ہی۔
اگر نامہ نگار تہذیب کی یہ رائے صحیح تسلیم کرلی جائے کہ مرنے والی بیویاں مراسم
میں فضول خرچی کرتی تھیں تو اس بیوی کے مقابلہ میں جو محض اپنے ذاتی اخراجات
کا بوجھ ڈال کر شوہر کو زیر بار کر رہی ہے۔ وہ بیوی جو پانسو کی مالک ہو یقیناً یہ حق
رکھتی ہے کہ ۲۵۰ روپیہ بچے کی شادی پر اُٹھا کر اپنا دل خوش کرلے اور ۲۵۰
روپیہ محفوظ رکھے۔ اِن واقعات کا ثبوت سب سے بہتر یوں ہو گا۔ کہ آج سے
پچاس سال قبل کے حالات کا مقابلہ موجودہ حالات سے اِس طرح کیا جاے۔
کہ اس وقت مسلمان کس قدر مقروض ہوتے تھے۔ اور آج مسلمان قرض کی
کس قدر دستاویزیں لکھ رہے ہیں۔

افسوس ہو کہ میں نامہ نگار تہذیب کے اِس خیال سے بھی متفق نہیں
ہوں کہ پہلی بیویاں توہمات اور تعویذ گنڈوں میں زیادہ مبتلا تھیں۔ جس طرح
آج کی تعلیم یافتہ اِن باتوں سے دور رہتی ہیں۔ اِس طرح اُس وقت کی پڑھی لکھی
بھی ان باتوں کو پسند نہ کرتی تھیں۔ جاہل اُس وقت بھی یہی کرتی تھیں۔ اور
اب بھی یہی کرتی ہیں۔

نامناسب نہ ہو گا۔ اگر میں اِس موقعہ پر پیری مریدی کی رفتار سابق کا
مقابلہ دَورِ حاضرہ سے کروں اور یہ سوال کروں کہ پیروں کا وہ گروہ زیادہ
متمول تھا یا یہ۔ یعنی پچاس برس پہلے کے پیر زیادہ خوش حال تھے یا آج کے۔
اِس کے بعد دوسرا سوال ہو گا کہ اگر آج کے پیر زیادہ خوشحال ہیں تو ان کی آمدنی
کے ذرائع مرد زیادہ ہیں یا عورتیں؟ میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا۔ مگر میرا

حضرت امیر خسرو جیسی باکمال ہستیاں مصروف خواب ہیں۔ اِدھر ہمایوں اُدھر صفدر جنگ۔ المختصر دور تک یہ سلسلہ اسی طرح چلا گیا ہے۔ لیکن منبع مہرولی ہی ہے۔ جہاں فقیر اور بادشاہ دونو خاک کی سیجوں میں دفن ہیں۔

کل سہ پہر کو میں قطب میں تھا۔ دوپہر کے وقت فاختہ کی کوکو تہ خانہ سے جنگل میں لائی۔ دھوپ کی چادر دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور جہاں تک نگاہ جاتی تھی قبروں کا سلسلہ ختم نہ ہوتا تھا۔ ہوا گرم تھی۔ املی اور پیپل کے درخت مٹنے والوں کی وداع پر کہرام مچا رہے تھے۔ بگولے شہر خموشاں کی خاک چاروں طرف اُڑاتے پھرتے تھے۔ اور فاختہ کی صدا اِن ذرات کے گلے میں بانہیں ڈال رہی تھی۔ دوپہر کا سناٹا اس خاموش آبادی میں طاری تھا۔ مگر مُردوں کی اس سُنسان مجلس میں کائنات کی اکثر اشیاء موسیقی کا کمال دکھا رہی تھیں۔ ہوا کے ہاتھ میں ساز تھا۔ فاختہ غزل خواں تھی۔ اور پتے رقص کر رہے تھے۔ آفتاب کی تیز شعاعوں نے مجھے دھکے دیکر نکالا اور میں شیخ کے مقبرہ پر چلا گیا۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے احاطہ میں جو مفتی والوں کا قبرستان مشہور ہے داخل ہوا تو کتنوں میں وہ نام نظر آئے جو میری آنکھوں کے سامنے زمین کا پیوند ہوئے ہیں۔ پیاری بہن صغری بیگم کی قبر دیکھی جو میری پھوپی زاد بہن اور شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم کی صاحبزادی تھیں۔ قبر دیکھتے ہی اُن کی صورت آنکھوں کے سامنے آگئی۔ اور ساتھ ہی اُن کی عادات وخصائل۔ اُن کی پاک زندگی۔ ان کا اسلام اور اُن کے کارنامے۔ معاً ذہن اس مضمون کی طرف منتقل ہوا جو پچھلے دنوں میں حامد ہ بیگم نے تعلیم نسواں کے سلسلہ

قطب صاحب کے جواہر ریزے

دھلی سے گیارہ میل کے فاصلہ پر قصبہ مہر ولی ہے جسکو قطب صاحب اور خواجہ صاحب بھی اِس لئے کہتے ہیں کہ وہاں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ قطب مینار یعنی قطب صاحب کی لاٹھ اسی جگہ واقع ہے۔ یہاں کا چپہ چپہ تاریخ کا دفتر ہے اور قدم قدم پر جلیل القدر بادشاہوں اور بزرگوں کی قبریں اور مزارات ہیں ایک قطب مینار ہی نہیں بیسیوں پرانے زمانہ کی عمارتیں اپنے مالکوں اور مکینوں کی یاد تازہ کر رہی ہیں۔ اولیاء مسجد شمسی تالاب۔ شیخ کا مقبرہ۔ غرض یہ وہ جگہ ہے جہاں میلوں اور کوسوں خزانے دفن ہیں جنکی نظیر سرزمین ہند پر مشکل سے ملے گی۔

چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

یوں تو دلی دروازہ سے باہر نکلتے ہی کھنڈر شروع ہو جاتے ہیں اور نظر اُن کچی پکی قبروں اور ٹوٹے پھوٹے مزاروں پر پڑتی ہے جن کے بسنے والے علم و فضل اور زہد و اتقار کے ڈنکے بجا گئے۔ مہندیوں میں مولانا شاہ عبد العزیزؒ کا وہ خاندان آرام کر رہا ہے جس نے متواتر چھ نسلوں تک ایسے جید عالم پیدا کئے کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ سلطان جی میں حضرت نظام الدین اولیا۔

جس شخص کو قرض کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ گروی گانٹھے سے محفوظ تھا۔ چیز رکھی اور روپیہ اُن سے لے گیا۔ وہ بڑی جائداد کی مالک تھیں۔ مگر جب کبھی مرمت کی ضرورت ہوتی جس قدر چونہ اینٹ مٹی آتا۔ پہلے اس سے کسی مسجد کی مرمت ہوتی اسکے بعد جائداد کی۔ شہر کی ایسی مسجدیں کم ہوں گی جن کے مؤذن اور پیش امام ان کو دعائیں نہ دیتے ہوں۔

مولوی عبدالرب صاحب مرحوم جو ان کے حقیقی چچا تھے جس وقت سہارنپور کی جامع مسجد بنوا رہے تھے وہ حیدرآباد سے دہلی آئی ہوئی تھیں نقد روپے کے علاوہ انہوں نے اپنا تمام زیور جو کئی ہزار کی مالیت تھا مسجد میں دیدیا۔ اس زیور میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ وہ زیور تھا جو اُن کو میکے سے جہیز میں ملا تھا۔

یہ چند باتیں ہیں اور یہ وہ باتیں ہیں کہ کسی ایک عورت میں نہیں۔ اُس وقت کی اکثر عورتوں میں موجود تھیں۔ اور وجہ صرف یہ تھی کہ تعلیم مذہبی احساس پیدا کرتی تھی۔ آج میں جس چیز کو رو رہا ہوں وہ یہی ہے۔ حامیانِ تعلیم موجودہ فرماتے ہیں کہ اس نصاب میں جو آجکل پڑھایا جا رہا ہے جو خرابی ہو وہ بتائیے۔ میں نہیں جانتا اس کا کیا جواب دوں۔ مگر جو سوال اوپر کیا ہے اُسکو پھر دوہراتا ہوں کہ

کیا مدرسوں کی مروجہ تعلیم مذہب کا یہ احساس پیدا کر سکتی ہے؟

عصمت ۱۹۲۶ء

میں اگلی اور موجودہ تعلیم کے متعلق لکھا تھا اور جس کے جواب میں کسی صاحب نے
مرنیوالیوں کو جاہل اور موجودہ لڑکیوں کو تعلیم یافتہ فرمایا تھا۔ یہ بحث گو اس لئے
زیادہ مفید نہیں کہ دورِ حاضرہ کی لڑکیوں کے ذہن میں ان کے ناعاقبت اندیش
خیرخواہوں نے یہ جھادیا ہے کہ موجودہ تعلیم ہر اعتبار سے ان کے واسطے مفید ہے۔
جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب مسلمان لڑکیوں سے کوسوں دور ہوگیا۔ لیکن جی چاہتا ہے
کہ عصمتی بہنوں کو ان مرنیوالیوں کی ایک جھلک دکھادوں۔ اور شیدائیان
تعلیم جدید سے دریافت کروں کہ اسلام کی کسوٹی پر یہ جوہر پارس ہیں یا پتھر۔
اور کیا تعلیم جدید بھی کوئی ایسا نمونہ پیش کرسکتی ہے ؟

صغریٰ بیگم مرحومہ کا زمانہ زیادہ دنوں کا نہیں اب ہی کا ہے۔ ان کے دیکھنے
والے بیسیوں مرد اور عورتیں زندہ ہیں۔ ان کی رحلت کو سات برس ہوئے ہونگے۔
ان کا چھوٹا بچہ اشرف ایم۔بی۔سی۔ایچ۔بی۔ حیدرآباد میں ہے۔

ان کا اردو کا خط اتنا پاکیزہ تھا کہ آجکل کی تعلیم یافتہ لڑکیوں میں مشکل سے
شاید دو فیصدی کا ایسا ہو۔ وہ انگریزی نہ جانتی تھیں۔ لیکن فارسی بہت اچھی تھی۔
گلستاں، بوستاں، سکندرنامہ، شاہنامہ حفظ تھا۔ کلام اللہ کی حافظہ نہ تھیں۔ مگر
مشکل سے ممکن تھا کہ ان کے سامنے کوئی غلط قرآن شریف پڑھے اور وہ نہ ٹوکیں۔
نماز، روزہ کی سختی سے پابند تھیں۔ رمضان بھر مساجد کی افطاریوں کے علاوہ
نہ معلوم کتنی عورتیں ان ہی کے ہاں روزہ کھولتی اور کھانا کھاتی تھیں۔ جو چیز آج
کانفرنسوں اور انجمنوں اور ریزولیشنوں سے حاصل نہیں ہوتی وہ انکے دم سے
اس طرح پوری ہوتی تھی کہ غریب عزیزوں کی مقررہ تنخواہوں کے علاوہ محلہ میں

میں باغیچہ، رنگ برنگ کے پھول، اعلیٰ درجہ کا فرش، دریاں، قالین، میز کرسی۔ سونے کا، بیٹھنے کا، ملنے کا کمرہ الگ، اور ہر ضرورت کا سامان جدا، یہ مہذب بیوی جاڑوں کے موسم میں ساڑھے آٹھ بجے سو کر اُٹھیں، ماما دوا کی شیشی لائی، اُٹھتے ہی دوا پی، اس کے بعد منہ ہاتھ دھویا غسل خانہ میں گئیں، کنگھی چوٹی کی، کپڑے بدلے، آرام کرسی پر آکر بیٹھیں، چا پی اور ڈاک دیکھنے لگیں۔ گیارہ بجے ماما نے اطلاع دی کھانا تیار ہے، حکم دیا "لے آؤ" باورچی نے کھانا نکالا، مامائیں کشتیاں لیکر آئیں، اور کھانا کھایا گیا۔ کھانے سے فراغت پا منصف صاحب کچہری گئے۔ بیوی قیلولہ کو لیٹیں۔ سینے والی کپڑے لیکر آئی۔ کوئی پسند کیا کوئی ناپسند۔ اور آرام خاص میں پہونچیں۔ برآمدہ میں آئیں تو ایک جوان عورت اور دو بچے منتظر تھے۔ بیوی کی صورت دیکھتے ہی عورت اُٹھی۔ جھک کر سلام کیا اور گڑگڑا کر کہا۔

"بیگم میں مصیبت ماری ہوں۔ یہ دو یتیم بچے ہیں۔ ہم سب کل سے بھوکے ہیں۔ اپنے بچوں کا صدقہ ہمارا پیٹ بھر دیجئے۔"

بیوی - "تمہارے ساتھ سلوک کرنا سخت گناہ ہے۔ تم کو یہاں آنے کی اجازت کس نے دی۔ بلاؤ دربان کو۔ تم لوگوں نے بھیک مانگنے پر کمر باندھ لی۔ کیوں نہیں محنت مزدوری کرتے۔ یہ چھوٹا بچہ تو خیر دودھ پیتا ہے مگر بڑا پانچ سال سے کم نہیں۔ اسکو نوکر رکھوا دو، تم خود نوکری کرو۔"

عورت - "بیگم میں نوکری کے قابل ہوتی تو بھیک نہ مانگتی۔ میں دق میں گرفتار ہوں۔ مجھ کو اس وقت بھی بخار چڑھا ہوا ہے۔ یہ بچہ ابھی تین برس کا ہے۔ نوکری کے

اگلی اور اَبکی بیویاں

مُسلمان تعلیم نسواں کے مخالف نہیں۔ حدیث قرآن ان کا ایمان،
اور ارشادِ نبوی ان کی جان، مگر نہ معلوم زمانہ کا اثر ہے یا تقاضائے تمدن کہ
گو پڑھی لکھی بیویوں، مہذب لڑکیوں اور تعلیم یافتہ ماؤں کی کمی نہیں، مگر
وہ جوہر جو اگلی بیویوں میں تھے روز بروز مٹتے جارہے ہیں۔ اور مقابلتہً اسی
نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ یا تو وہ جوہر جوہر ہی نہیں، خبط تھے یا موجودہ تمدّن
ناقص اور غیر مکمل ہے۔

اس بحث پر کچھ لکھنے سے پہلے ہم ایک ایسی بیوی کی روزانہ زندگی پر
نظر ڈالتے ہیں جو اس زمانہ میں اپنی زندگی بسر کر رہی ہے۔
اسکی عمر تقریباً بیس بائیس سال کی ہوگی، تین بچّوں کی ماں ہے شوہر
ڈھائی سو روپے کا مُنصف اور ایک معزز آدمی ہے۔ گھر میں دو مامائیں۔
دروازے پر ایک باورچی، ایک نوکر، گھوڑا گاڑی، سائیس، کوٹھی کے احاطہ

کہدو میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ہمارا تبادلہ ہوگیا۔ ہم اپنا چندہ وہاں کی انجمن میں دیں گے۔"

شام ہوگئی، اندر سے ماما نے لیمپ اور لالٹینیں باہر پہونچائیں، اور باہر سے مشعلچی نے تیل بھر جلا اندر بھیجدیں۔ میاں موجود نہ تھے بیوی کچھ دیر تک ٹہلتی رہیں اور سوچتی رہیں۔ عشا کے وقت باوجود فکر کے تھوڑا سا باجہ بجا اور دس بجے کے قریب اخبار پڑھتے پڑھتے سوگئیں۔

اِن بیوی کو یہیں چھوڑ یئے، اور نگاہ کو چند لمحہ کے واسطے آج سے تیس چالیس برس پہلے کی بیویوں پر دوڑایئے۔ وہی شہر شاہجہاں آباد اور صبح کا سہانا وقت، ایک مختصر سا مکان ہے۔ جہاں میز کرسی دری قالین کچھ نہیں۔ ٹاٹ پر سفید چاندنی بچھی ہوئی ہے۔ مگر اس طرح سے کہ سلوٹ آلود نہیں۔ گھر والی ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہیں، صبح چار بجے اُٹھیں۔ ماما کوئی نہیں ہے۔ مگر دور کے رشتہ کی ایک بڑھیا کام کاج کو موجود ہے۔ اس کو نہ جگایا۔ آگ سلگائی۔ پانی گرم کیا۔ وضو سے فارغ ہو میاں کے واسطے گرم پانی رکھ اُن کو جگا کر نماز میں مصروف ہوئیں۔ پڑھ چکیں تو بچوں کو اُٹھایا۔ وہ نماز میں مصروف ہوئے۔ آپ کلام اللہ لیکر بیٹھیں۔ آفتاب نکلنے سے پہلے نماز اور تلاوت سے فرصت پا، کھانے کی تیاری شروع کی۔ سالن رات کا تیار تھا۔ آٹھ بجے سے پہلے پہلے آدھی سے زیادہ روٹی پکالی۔ میاں کھانے بیٹھے۔ گرم گرم روٹی اُن کو کھلائی۔ بچوں کو دی۔ میاں پچاس روپے کے نہر میں سر رشتہ دار تھے۔ وہ کھانا کھا کر اُٹھے، لپک کر پانوں کی ڈبیا بنائی۔ وہ کچہری گئے تو آپ کھانے بیٹھیں۔ دو ہی نوالے کھائے ہوں گے کہ پڑوسن کی ایک لڑکی نے آکر کہا:-

لائق نہیں۔ آپ اگر ہمارے ساتھ کچھ سلوک کریں تو اچھا ہے۔ ورنہ ہم چلے جاتے ہیں۔"

بیوی:- "بھاگ جاؤ اور آئندہ کبھی نہ آؤ۔ تمہاری بیماری کا ذمہ دار خدا ہے۔ ہم نہیں ہیں۔ تمہارا ہم پر کیا حق ہے؟"

عورت:- "نہیں بیگم کچھ حق نہیں۔"

عورت نے اپنے بچوں کا ہاتھ پکڑا اور چلی گئی۔

چار بجے ہوں گے منصف صاحب کچہری سے آئے۔ چار کا دَور شروع ہوا۔ اور میاں بیوی کی باتیں اس طرح ہوئیں۔

میاں:- "آج تبادلہ کا حکم آگیا۔ اب مجھے زیادہ سے زیادہ پرسوں یہاں سے جانا چاہیئے۔ مگر یہاں کا حساب صاف کرنا ضروری ہے۔ تین سو چوہتر روپے چھ آنہ تصویروں کے دینے ہیں۔ اور ایک سو چالیس منزوالے کے۔ تراسی روپے کے قریب درزی کے ہونگے۔ اور سات سو سے اوپر بزار کے۔ اب بتاؤ میں کیا کروں۔ جس طرح ہو یہ روپیہ ادا کردو، ورنہ تمام عزّت و آبرو خاک میں مل جائے گی۔"

بیوی:- "میں کیا بتا سکتی ہوں، کوئی زیور بھی نہیں کہ وہی الگ کردیا جائے۔ میں آج ذرا درد سے چھوٹی ہوں تو تم نے یہ ذکر شروع کرکے مجھے اور پریشان کردیا۔"

پانچ بج چکے تھے کہ زنانہ یتیم خانہ کے سکرٹری کا آدمی آیا اور کہا "جلسہ میں آپ کا انتظار ہورہا ہے، بیوی نے کہا ہے کہ اگر آپ نہ آئیں تو تمام جلسہ درہم برہم ہوجائے گا۔ اور ان یتیموں کی جڑا دل یونہی رہ جائے گی۔"

بیوی نے باتیں سُنیں پرچہ پڑھا اور اُس سے کہہ دیا "میرا سلام دو اور

گور و کفن کیا اور مغرب سے پہلے اپنے گھر چلی آئیں۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر میاں بیوی میں یہ باتیں ہوئیں :۔

میاں "شادی کی تاریخ تو اب قریب آگئی۔ یہ سات سو روپے موجود ہیں۔ اسی میں سب کام کرنے ہوں گے"

بیوی "(ہنس کر) تم اپنا جی نہ کُڑھاؤ۔ جس دن صالحہ پیدا ہوئی تھی اُسی دن سے آج کا دن میرے سامنے تھا۔ جو کچھ ہو سکا جوڑ جاڑ کر رکھا ہے۔ کپڑے کا تو زیادہ فکر نہیں، چودہ جوڑے تیار ہیں۔ فقط ایک پر مصالحہ نہیں ہے۔ اسمیں سے پانسو کا زیور کردو، دو سو اوپر کے لئے رکھ لو، سوا چار سو میرے پاس اور ہیں"

میاں "واہ واہ ماشاء اللہ۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے اور تمہارے بچوں کو ایسی بیویاں دے"

پڑھنے والے اب خود فیصلہ کریں کہ یہ باتیں کام کی تھیں یا خبط، اور موجودہ طرزِ تعلیم ناقص ہے یا مکمل۔

خطیب ۱۹۱۷ء

"خالہ! اماں کہہ رہی ہیں ننھا رو رہا ہے میرا جی اچھا نہیں۔ ایک روٹی اور ذرا سا سالن دیدو۔"

برتن میں سالن نکالا، دسترخوان سے روٹیاں لیں اور اُس کو دیں۔ کھانے سے فارغ ہوئی نہیں، کہ ایک برقع والی آنکلی۔ چپکے چپکے کچھ باتیں کیں اور خاموش بیٹھ گئی۔ کچھ دیر سکوت رہا۔ پھر گھر والی نے آہستہ سے کہا:۔

"شہزادہ روتی کیوں ہے۔ اللہ سب کی مشکلیں آسان کردیتا ہے، محلّہ کی بیٹی اپنی بیٹی ہوتی ہے۔ سات پانچ کی لاٹھی ایک جنے کا بوجھ۔ برتن تو میرے پاس کوئی نہیں، ہاں دو جوڑے موجود ہیں ٹھہر جا شائد خالہ جان کے برتن نکلے توسہی"۔

ڈبیا جلا کر اندر کوٹھری میں گئیں۔ دو بجے تک ڈھونڈھ ڈھانڈھ سات برتن جمع کئے۔ دو جوڑے نکالے اور دس روپے کی پڑیہ باندھ کر اُسکی نذر کی۔ نماز کا سلام پھیرا تھا کہ دھوبن کی لڑکی روتی ہوئی آئی۔

"اری محمدی کیا ہوا اماں کیسی ہے؟"

محمدی: "بیوی وہ تو اللہ کے ہاں گئیں۔"

بیوی: "انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پھر اب گھر میں کون کون ہے"

محمدی: "کوئی نہیں میں ہی ہوں، خبر نہیں کیا کیا کرتے ہیں"

بیوی: "ہائے کیا جنتی بیوی تھی، تیس برس میں کبھی ایک چیتھڑا تک اِدھر سے اُدھر نہ کیا۔ ٹھہر جا بیٹی میں چلتی ہوں۔ جا ڈولی لے آ۔"

بڑے لڑکے کو ساتھ لے وہاں گئیں۔ اپنے ہاتھ سے نہلایا دُھلایا۔ اپنے پاس سے

حدود میں داخلہ ہوا! ذرا اِس دلہن کا اقبال تو دیکھو۔ مرد تو مرد عورتیں تک سارے
جھگڑے بھول بھال اور گھر کے دھندے چھوڑ چھاڑ مہمان کے استقبال کی
تیاّریاں کر رہی ہیں۔ مزا یہ ہے کہ سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے۔ اِدھر امیر
اپنے کمرۂ نشست کو مختلف تصاویر سے مزیّن کر رہا ہے۔ تو اُدھر فقیر اپنے
کچےّ دھابے پر لال فندھی لپیٹ رہا ہے۔ کہ کسی طرح حق مہماں نوازی ادا
کر لوں! کچھ عجیب طلسم کا سا سماں ہے۔ جدھر نظر جاتی ہے ہر شخص اپنی کینچلی
بدلے فلاح و بہبودی کے گلدستے ہاتھ میں لئے موجودہ طرزِ معاشرت پر لعن
طعن کرتا ترقی کی صدائیں لگا رہا ہے۔

کھڑے کھڑے پاؤں شل ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔
سوچتے سوچتے دماغ چکرا گیا۔ مگر ابھی اُس سیمتن کا نظارہ نصیب نہیں ہوا۔
جس کے انتظار میں بیسیوں راتیں سحر اور مہینوں دن بسر کئے ہیں۔

میدانِ ترقی کے بہادرو! تمہارا اشتیاق سر آنکھوں پر۔
تمہاری سرگرمی چشمِ ما روشن دلِ ماشاد۔ مگر عقلِ سلیم اتفاق کلی میں متامل ہے
جس طرزِ معاشرت کو جہالت سے تعبیر کر رہے ہو' ذرا اس پر غور کی نظر تو ڈالو!
شہر آبادی یعنی دِلّی بسے کے یہی چراغ سحری جو اب ایک آدھ جھونکے
کے مہمان ہیں۔ اپنی روشنی سے محلہ بھر کو منوّر کر رہے ہیں! چشم تامل سے
دیکھنا کیسی کیسی جھلکیاں نظر آ رہی ہیں!

کچاّ پکاّ گارے مٹی کا گھر ہے۔ مگر لپا لپا یا چندن سا! شرم حیا کی گٹھڑیاں
حسن و جمال کی دیبیاں جھاڑو بہارو سے فراغت پا' پکا ریندھ کھانے سے

اگلے لوگ

اگلے وقتوں کے بچے کھچے بڈھے ٹھڈے جو صبح شام کی ہوا کھا رہے ہیں اُن کا ذکر نہیں۔ بحث تو اُن اچھی بھلی صحیح تندرست صورتوں سے ہے جو رفتارِ زمانہ کے پہئیے دونوں ہاتھوں سے دھکیل رہے ہیں۔ تھوڑا بہت کر لیا اور بہت کچھ کرنا ہے۔

منصف مزاج دوستو! آخر وہ موقع آ گیا جس کا مدت سے ارمان تھا۔ اور وہ وقت آ پہنچا جس کے واسطے برسوں سے آنکھیں ترس رہی تھیں! آج وہ دن ہے کہ پکی محلسرائے ہو یا ٹوٹا سا گھر۔ بڑا بھاری شہر ہو یا چھوٹا سا گاؤں۔ دیوار و در سے بھی ترقی کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ گوشے گوشے اور چپے چپے۔ غرض کونے کھدرے تک تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ملکۂ مغرب کی سواری اپنے وطن سے روانہ ہو کر دریائی مسافت طے کر رہی ہے۔ اور کوئی دم جاتا ہے کہ مشرق

ذرا ان بڑے میاں کو دیکھنا۔ مُنڈا ہوا سر بھڈی جوتی۔ کھدّی ململ کا ڈھیلا ڈھالا کُرتہ۔ ہاتھوں میں دَونے۔ بغلوں میں پوٹلیاں۔ سر پر گڑ بھیندے لڑھکتے پڑھکتے چلے آرہے ہیں۔ ان پر بھی توسن لو۔ مسجد میں ظہر کی نماز پڑھی۔ پڑوس کی پردہ نشین رانڈیں، جن کے ہاں گھس لگانے کو مرد کا نام نہیں کبھی کی بیٹھی راہ تک رہی تھیں۔ ان کے گھروں پر گئے۔ پیسے لئے۔ سودے پوچھے اپنا کاروبار رکھ۔ محنت مزدوری چھوڑ بازار گئے! یہ انھیں دکھیاروں کا بوجھ ہے!

زمانہ کے نبض شناسو! عالم بنو، فاضل بنو، لائق ہو، فائق ہو، کچھ ہی بن جاؤ اور کچھ ہی ہو جاؤ۔ مگر پچھوا صاف بتا رہی ہے کہ اب یہ انداز رخصت ہوئے۔ البتہ آنے والی نسلیں سُن لیں گی۔ کہ ہم ان بزرگوں کی اولاد ہیں۔ جن کے قدموں میں خُلق و تہذیب کے دریا لوٹتے تھے۔ زمانہ ان واقعات کو فسانہ بنا دیگا۔ مگر یہ کہانیاں بہت روز تک باقی رہیں گی۔

ذرا زمانہ جاہلیت کے بہن بھائی دیکھنا۔ محبت کی سرسبز و شاداب ٹہنی پر کیسے خوشرنگ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ہے تو زچہ گیری مگر جوشِ محبت کی پوری تصویر ہے۔ بھائی کے ہاں بچّہ پیدا ہوا۔ پردیسن بہن یہ سُن کر پھولی نہیں سمائی۔ بھتیجے کے لئے ہنسلی کرڑے۔ بھاوج کے لئے جوڑا لیکر بھائی سے نیگ لینے آئی۔ کس محبت سے کہتی ہے۔

بیرن بھیّا میں تیری ماں کی جائی ہولرسن کر بدھاوا لیکر آئی
چھاتی دُھلائی کٹوری لوں گی تولٹ دُھلائی روپیہ

پہلے کھلانے بیٹھیں۔ باسی کوسی۔ بسی کُسی جو میسّر ہے پڑوس کے اندھے دھندوں کو بھیجا۔ کنبہ کے غریب محتاجوں کو دیا۔ بچا کھچا۔ اچھا بُرا آپ کھایا۔ ذرا انصاف کی نظر سے دیکھنا۔ اِن کے زیورِ عفت و عصمت میں ہمدردی کا جھومر کِس آب و تاب سے چمک رہا ہے!

اِن کو خاوندوں کے ساتھ برابری کا دعویٰ نہیں۔ اپنی راحت۔ اپنا عیش۔ اپنا سکھ۔ اپنا چین۔ ان کی خوشی پر قربان کر چکیں! طوقِ غلامی سمجھو یا اطاعت و فرمانبرداری کا چندن ہار، ان کے گلے میں کچھ ہے تو سہی۔ ڈیوڑھیوں پر گھڑیوں گھنٹوں کھڑے رہو۔ ان کی ڈیوڑھیوں پر گھڑیوں کان لگا کر سُنو۔ ہوا ان کی آوازیں کچّی دیواروں سے باہر نہ لائیگی۔

خدا معلوم ان جاہلوں کی طبیعت میں قدرت ہی نے کوئی مادّہ ودلیعت کیا ہے یا صحبت کا اثر اور تربیت کا فیض ہے، بہنیں بھائیوں پر پروانہ۔ بھائی بھائیوں پر جاں نثار! لڑکیاں اطاعت گزار۔ لڑکے فرماں بردار! بڑوں کا ادب۔ چھوٹوں کا لحاظ تعظیم۔ شرم۔ حیا۔ تمیز۔ ان کی گھٹّی میں ہے!

یہ سفید ڈاڑھیاں۔ یہ متبرک صورتیں۔ جو عنقریب صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائیں گی۔ آج تمہارے راج میں بیوقوف سہی۔ جاہل سہی۔ لکیر کے فقیر سہی۔ مگر ان کی عمر کے پچھلے ورق تو لوٹ کر دیکھو! زمانہ کا رُخ بدل جائے۔ ہوا کے جھکّڑ چل جائیں۔ ان کے کارنامے مٹنے والے نہیں! ان پتھروں سے مروّت اور محبّت کے ایسے چشمے پھوٹے کہ راستہ چلتے مسافر مگن ہو گئے۔

کی شریک ایک آدھ شمع اِدھر اُدھر ٹمٹما رہی ہے۔ جو نسیم کے ایک دو جھونکوں کی محتاج ہے۔ جن مقدس صورتوں کی برکت تھی وہ سب خاک میں مِل گئیں۔

عزیزو! دوستو! ایک وقت آئے گا۔ اور ضرور آئے گا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھو گے۔ اور سر پہ ہاتھ رکھکر رو دو گے۔ اور یہ ریزۂ جواہر زیرِ زمیں ہونگے۔ ڈھونڈو گے۔ مگر بے سود۔ پرکھو گے۔ لیکن بے وقت۔

بہارِ مشرق کے باغبانو! گو آج سُنسان جنگل میں پڑے آرام کر رہے ہو۔ مگر چمنستانِ حیات میں ایسے پھول کِھلا گئے کہ قیامت تک نہ مرجھائیں گے۔ بھانت بھانت کے پکھیرو اور رنگ برنگ کی بُلبُلیں بیٹھ کر چہکیں گی۔ اور ان کی مہکار شرق سے غرب تک پھیلے گی۔ خزاں دُنیا بھر کو تاراج اور مسمار کرے۔ مگر تمہارے مبارک ہاتھوں کی گلکاری صفحۂ ہستی سے مٹنے والی نہیں۔

سنہ ۱۹۰۹ء

پاؤں دُھلائی چیری لوں گی نوشو کے چڑھن کو گھوڑا

بھائی کی خوشی میں شریک ہو کر نیگ لینے کے حقوق کیسے مزے سے جتا رہی ہے۔ بھائی سے اتنا خطاب کر چکی تو بھاوج سے دو دو باتیں ہیں ؎

یہ نہ سمجھو بھاوج موری نند ہیتی نہیں آئی
تیرے للہ کو ہنسلی اور کڑوے تجکو جوڑا لائی

بھائی پر تو وہ زور تھا۔ مگر اِس خیال سے کہ بھاوج کو بار خاطر نہ ہو یوں کہتی ہے۔ حقیر نہ سمجھو کہ تیرے دروازے پر لینے آئی۔ بڑوں کی مثل "بھائی ہس لیجئے بھتیجا مس دیجئے" جو اپنا حق ہے وہ مانگ رہی ہوں۔ جو مجھ پر ہے وہ یہ موجود ہے۔

یہ تمام قصہ طے ہو جانے کے بعد یہ آخری بات جو بہن کے مُنہ سے نکلتی ہے وہ ایک پیٹ میں پاؤں پھیلانے کا سچا اثر۔ ایک گود میں دودھ پینے کا پورا جوش۔ اور خالص محبت کا پکا ثبوت ہے۔ جس دل سے یہ الفاظ نکلتے ہیں۔ اُس کی حالت قابلِ غور ہے۔ کیسی سچی اور اچھی دعا ہے ؎

باگن میں جیسے آم پھلے رے ایسے پھلے مورا بھائی

اللہ العالمین جس طرح باغوں میں مور آکر آم پھلتا ہے۔ اُسی طرح میرا بھائی پھلے پھولے۔ بیٹے ہوں۔ پوتے ہوں۔ اُس کے کھیڑے بسیں۔ اور میرے باپ دادا کا نام روشن ہو۔

ملکۂ مغرب کے مشتاقو! یہ جلسہ ختم ہوا۔ اور صحبتیں رخصت ہوئیں۔ جن چراغوں کی روشنی در و دیوار تک پھیلی تھی۔ کبھی کے بجھ گئے۔ صحبتِ شب

واسطے مفید ہوسکتی ہے یا اُن کی تقسیم اعضار کی لیاقت، تمدن، معاشرت، اور مذہب کے لحاظ سے ہونی چاہیئے۔ ورزش کے جو طریقے عام طور پہ رائج ہیں۔ مثلاً ڈنڑ مگدر، ڈمبل وغیرہ۔ ان میں کپڑے اُتار لینا بہتر ہوتا ہے۔ مگر عورتیں مجبور ہیں۔ لیکن ان عورتوں کا ذکر اس وقت نہیں ہے جو مردوں کے مجمع میں بے باکانہ رقص کر سکتی ہوں۔ اِس لئے اُن کے واسطے کوئی ایسی محنت ہو کہ ورزش بھی ہو جائے، اور اُن کی شرم وحیا میں بھی فرق نہ آئے۔ ہندوستان کی عورتیں نہ صرف ہندوؤں کے عہد میں بلکہ شاہان مغلیہ کے دور میں بھی مردمیدان ثابت ہوئی ہیں، اور صرف سپہ گری ہی ایسی کافی ورزش تھی کہ اُس کے سامنے ہر ورزش ہیچ تھی۔

جب وقت نے مشرقی دُلہن کے جسم سے عروج کا لباس عروسی اُتار کر سُہاگ کا خاتمہ کیا، اور زوال کا رنڈسالہ پہنا کر بیوہ بنایا، تو موجودہ پردہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس پردہ میں رہ کر اور یہ معاشرت رکھ کر عورتوں کا ورزش کرنا مشکل تھا، حکومت اُجڑ چکی، امارت کا خاتمہ ہو گیا تھا، بے فکری، آزادی، سیر سپاٹے، سب فنا ہو چکے تھے، اب ورزش کی کیا صورت ہوسکتی تھی۔ اس موقعہ پر مشرق لاریب مستحق تحسین ہے کہ لڑکیوں اور عورتوں کے سپرد جو کام کئے گئے، وہی خاصی اچھی ورزش تھی، کواری اور ہشیار بچیوں کا کام یہ تھا کہ وہ گرمی کے موسم میں پانی کے گھڑے بھر کر کوٹھے یعنی بالاخانہ پر لے جائیں، اور چھڑکاؤ کریں۔ اور اگر بالاخانہ نہیں ہے تو انگنائی میں غرض پانی بھرنا۔ چھاننا، تازہ باسی الگ کرنا، باورچی خانہ میں، غسل خانہ میں پہنچانا

عورتوں کی ورزش

منجملہ ان اثرات کے جو مشرق مغرب سے نہ صرف لے چکا بلکہ لے رہا اور لینا چاہتا ہے ایک ورزش نسواں بھی ہے۔ ابھی تین چار ہی ہفتے ہوئے میں نے کسی زنانہ پرچے میں ایک مضمون اس کے متعلق دیکھا تھا۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ جو شخص چاہے وہ مرد ہو یا عورت، صرف کھانے پہننے اور سونے سے واسطہ رکھے گا، اُس کی صحت برباد ہوگی۔ دُنیا بھر کے امراض اُس پر حملہ کریں گے۔ اور پچاس سال کی زندگی پچیس تیس ہی برس میں ختم ہو جائے گی۔ اِس لئے ورزش یعنی اعضاء سے محنت لینی صحت کے واسطے نہایت مفید ہے اور بعض امراض میں تو سو علاجوں کا علاج ورزش یا ہوا خوری وغیرہ ثابت ہوئی ہے۔ ہندوستان کے اُس حصّہ کو چھوڑ کر جہاں مرد کا اطلاق صرف مرد پر ہوتا ہے۔ اور یہ لفظ شوہر کے معنی رکھتا ہے آدمی۔ انسان اور شخص میں مرد اور عورت دونوں شریک ہیں۔ اور اِس لئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ہی قسم کی ورزش مرد اور عورت دونوں کے

رسوم

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جس قدر زیادہ کسی قوم میں جہالت ہو گی، اُسی قدر بدعقیدگی توہمات رسوم اور لامذہبی میں گرفتار ہو گی۔ مذہب ہی ایک ایسی طاقت ہے، جو انسان کو اُس وقت جب کوئی طاقت کام نہیں کر سکتی، بُرے کام کرنے سے روکتی ہے، ورنہ بیٹھے بٹھائے کس کو ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ مذہب کے چکر میں پڑتا۔ اپنی خواہشوں کے خلاف بعض عیش اپنے اوپر حرام کر لیتا۔ شام کے وقت ایک شخص کو اطلاع ملتی ہے، کہ فلاں گھر میں سناٹا ہے۔ اور روپیہ کے صندوق موجود ہیں۔ زیور کی صندوقچی رکھی ہے۔ اور صرف ایک بڑھیا حفاظت کر رہی ہے۔ وہ مصمم قصد کر لیتا ہے کہ آدھی رات کے وقت "بڑھیا کو قتل کر دوں گا" اور تمام مال لے آؤں گا۔ وہ اس کے لئے تیار ہوتا ہے۔ گھر میں کود پڑتا ہے، اور اندر پہنچکر دیکھتا ہے۔ صندوق اور صندوقچے رکھے ہیں، بڑھیا کے پیٹ میں چھری بھونکنے کا قصد کرتا ہے۔ یہ آدھی رات کا وقت ہے۔ اس کے پاس کوئی مشیر یا اصلاح کار نہیں ہے۔ مگر یہاں ایک طاقت ہے جو اس کا ہاتھ روکتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ اپنی موت کے بعد ایک "ڈے آف ججمنٹ" یعنی یوم الحق بھی ہے۔ بڑھیا غریب ہے، کمزور ہے، اس کا قتل درست نہیں۔

اس طاقت کا نام ایمان، ضمیر، کانشنس یا مذہب ہے! رسوم بھی اسی خراب فعل کی ایک شاخ ہے۔ یعنی "رسوم میں کسی نہ کسی طرح خدا کے اختیارات کو معطل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "پھولوں" یعنی تیجوں میں اس لئے ایک معقول رقم صرف کر دی گئی ہے کہ خدا مجبور ہے کہ مردے کی مغفرت کر دے۔ یہی کیفیت شادی کی رسوم کی ہے۔

اُن کا کام تھا، سردی ہے تو پانی کی گھڑیا گرم کرتیں۔ بیاہی ہوئی لڑکیوں یا پوری عورتوں کے واسطے اُن کی عمر اور حیثیت کے موافق کام تھے۔ مثلاً آٹا گوندھنا، روٹی پکانا، چارپائیوں کی ادوائیں کھینچنی، گھر بھر میں جھاڑو دینی۔ بڑی بوڑھیوں کا کام اُن کی عمر کے موافق تھا، چھالیہ کترنی، ترکاری بنانی، سالن بگھارنا۔ مختصر یہ کہ کام ایسے تھے کہ پوری ورزش ہو جاتی تھی۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ کبھی مہینوں بھی دُکھ بیاری کا نام سُننے میں نہ آتا تھا، اگر اوسط نکالی جاتے تو آجکل شاید آمدنی کا چوتھائی نہیں تو دسواں حصّہ تو ضرور بیاریوں پر صرف ہوتا ہوگا۔ اُس وقت اوّل تو بیاریاں ہی کم تھیں، اور اگر تھیں تو اُن کا علاج کوڑیوں کا تھا۔ نسخہ کی قیمت بہت ہوئی تو دو پیسے۔ ورزشِ نسواں کے ضروری ہونے سے انکار نہیں، مگر مشرق میں یہ اس طرح تھی کہ پتہ ہی نہ چلتا تھا اور پوری ہو جاتی تھی۔

۱۹۲۲ء

مائیوں کی رسم

دنیا کی آنکھوں نے انقلاب کی جو عجیب و غریب تصویریں دیکھیں اُن میں اس صدی کی معاشرت اسلامی میں دو متضاد عنصر دکھائی دیتے ہیں۔ کل کی کیفیت یہ تھی کہ بیوی شوہر کا نام لینا معیوب سمجھتی تھی۔ لڑکی شادی کے بعد دنوں باپ بھائی کے سامنے تکلّف سے آتی تھی۔ لڑکا بزرگوں کے سامنے اپنے بچّہ کو گود میں لیتا شرماتا تھا۔ لڑکی مردوں کے سامنے خواہ وہ کیسے ہی عزیز ہوں ننگے سر بیٹھنا مکروہ سمجھتی تھی۔ آج کی حالت یہ ہے کہ بیگم اور مسز کا استعمال فخریہ اور اہلیہ گناہ۔ شادی کے بعد باپ بھائی سے بلا ضرورت گفتگو کرنا عیب تھا آج ہنر ہے۔ خیر عیب تھا یا ہنر اِس وقت اِس سے بحث نہیں ہمارے سامنے صرف مائیوں کی رسم ہے اور اسی حُسن و قبح پر بحث مقصود ہے۔

یہ خیال کہ مسلمانوں نے تمام رسمیں ہندوؤں سے لیں۔ کم از کم مائیوں کی رسم کے واسطے درست نہیں، کیونکہ اُن میں سوئمبر کی رسم موجود تھی جسمیں عورت کو شوہر کے انتخاب کا وہی حق حاصل تھا، جو اسلام نے عطا فرمایا ہے۔ مائیوں کی رسم مسلمانوں کی اپنی رسم ہے۔ اور اگر اس کا تعلق قرونِ اولیٰ

کہ اگر خدا کے اختیارات سلب نہیں کئے تو کم از کم اس سے تعلقات منقطع کر لئے گئے ہیں۔ طرفہ یہ ہے کہ ادائیگی رسوم نام ہے لامذہبی اور خدا سے دوری کا۔ شبرات کے حلوے، پٹاخے، عقیقہ کی دھوم دھام، یہ تمام باتیں انسان کی لامذہبی کا ثبوت ہیں، کیونکہ مسلمان کو تو اللہ حکم دیتا ہے کہ فضول خرچیوں سے بچو، کیونکہ مسرفوں کو اللہ دوست نہیں رکھتا۔ پھر اگر کوئی مسلمان شادی غمی یا اور کسی رسم میں روپیہ ضائع کرے تو وہ اللہ کا دشمن ہوا۔

مضمون کا یہ حصّہ اس طرح ختم کرنے کے بعد اب ہم یہ بھی دیکھیں گے، کہ کیا ہندوستان کے مسلمانوں کی تمام رسوم کا یہی حال ہے۔ بعض رسمیں یقیناً تباہ کن ہیں لیکن بعض رسموں کے ادا کرنے میں نہ روپیہ ضائع ہوتا ہے، نہ مذہب کے خلاف ہوتی ہیں۔ اور وہ ہماری معاشرت یا تمدن میں شامل ہو گئی ہیں۔ یوں صرف کرنے کو تو ایک شخص ایک وقت کے کھانے پر سو روپے صرف کر دے۔ لیکن آدمی کا پیٹ چند پیسوں میں بھی بھر سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں صرف وہ رسمیں لینی چاہییں جو نہ مذہب پر اثر کر سکتی ہیں نہ روپے کی محتاج ہیں۔ اور مشرق ان پر فخر بھی کر سکتا ہے۔

ہندوؤں کے ہاں سال میں ایک روز ایسا ہوتا ہے، کہ ہر بیوی اپنے شوہر کی سلامتی کا روزہ رکھتی ہے۔ ذرا اس رسم کے فلسفہ پر غور کیجئے۔ علاوہ اس عظمت کے جو شوہر کی طرف سے عورت کے دل میں پیدا ہو کیسا ہی سخت دل آدمی کیوں نہ ہو، اس درجہ محبّت کرنے والی عورت کی کتنی قدر کرے گا۔

یقیناً اس کا دل مائل ہوگا اور محبّت جو اس تعلق کا اصلی راز ہے۔ بہت کچھ ترقی کر جائے گی۔ اسی طرح ایک اور روز مقرر ہے، جس میں کوئی بہن اپنے شوہر کی کمائی کا کھانا نہیں کھا سکتی۔ وہ دن بھر روزہ رکھتی ہے۔ اور اُس کا یہ روزہ بھائی کی سلامتی کا ہے۔ اور شام کے وقت بھائی اپنی کمائی سے بہن کا روزہ کھلواتا ہے۔

عصمت ۱۹۲۲ء

عروسِ مشرق

سچّی بات یہ ہے کہ نہ مشرق فرشتہ ہے نہ مغرب۔ کمزوریاں سمندر کے اُس پار والوں میں بھی ہیں اور اِس پار والوں میں بھی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ہر مُلک کے رنگ ڈھنگ اپنے اپنے حالات کے اعتبار سے ہوتے ہیں جس طرح ہم کو مغرب کی بعض چیزیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ اِس طرح مغرب والے ہماری اکثر باتوں پر ہنستے ہیں۔ عادتیں تو الگ رہیں مذاق یعنی پسند میں بھی فرق ہے۔ ہمارے ہاں سفید بال بڑھاپے کی نشانی ہیں۔ لیکن بعض جگہ وہ پسند کئے جاتے ہیں۔ یہی کیفیت دانت اور دوسرے اعضاء کی ہے مختصر یہ کہ اسی طرح عادتوں کا حال ہے۔ ہمارے ہاں خاموشی شرم و حیا سمجھی جاتی ہے۔ دوسرے ملکوں میں عیب۔ ہمارے ہاں اگر کوئی دُلہن سسرال پہونچکر دنیا بھر کی باتیں شروع کر دے تو وہ بیحیا سمجھی جائے گی۔ مگر بعض جگہ اُس کی خاموشی معیوب خیال کی جائے گی۔ ہم اگر اُن کی ریس کریں یا وہ ہماری تو وہی مثل ہوگی کہ کوّا چلا ہنس کی چال وہ اپنی بھی بھول گیا۔ ہمارے ہاں کی دُلہن اگر ایسی خاموش ہو جائے گی کہ کسی سے بات ہی نہ کرے تو یہ شرم و حیا نہیں لغویت ہوگی۔ اِس لئے کوئی چیز حیا سے زیادہ نہ ہونی چاہیئے۔

مسلمان لڑکیوں کو دیکھنا چاہیئے کہ اُن کے ہاں جو خوبیاں ہیں یا سمجھی جاتی ہیں، دوسروں کے دیکھا دیکھی اُن کو ہاتھ سے نہ دیں۔ ایک دو نہیں بہت سی باتیں ہیں جن پر ہم ہمیشہ فخر کرتے تھے۔ اور اب وہ ہمارے پاس سے رخصت ہو رہی ہیں۔ یہ کچھ کم افسوس کی بات نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھنا چاہیئے کہ

کی مُسلمان خواتین سے ثابت نہ بھی ہو سکے، تو بھی اُس میں اگر خوبی ہو اور نقص نہ ہو تو ضرور مستحسن اور اس کا موجد مستحق شکریہ ہے۔ مائیوں کی رسم کے معنی ہیں کہ وداع سے چند روز پہلے لڑکی ایک علیحٰدہ کمرہ میں بٹھا دی جاتے۔ وہاں عام طور پر آمدورفت نہ ہو، غذا اُسے بہتر ملے۔ اور اُبٹنے وغیرہ کا استعمال کیا جائے۔

اب اس رسم کی غایت بالکل صاف ہے۔ حجاب شرم وحیا معاشرت اسلامی میں جوہر نسوانیت تھی، اور اس لئے جوں جوں روزِ وداع قریب آتا جاتا تھا، لڑکی پر یہ شرم زیادہ سوار ہوتی جاتی تھی، اور یہ ظاہر ہے کہ گھر میں اس وقت زیادہ تر شادی ہی کی باتیں ہوں گی۔ اور اس سلسلہ میں مردوں کی آمدورفت اور ان کا قیام اس زمانہ میں زیادہ ہوگا۔ ایسی حالت میں اُس لڑکی کا جو چار روز بعد دلہن بن رہی ہے مردوں کے سامنے موجود ہونا پڑنا پاتیں ملکانا اس وقت کے شیوۂ نسوانیت کے خلاف تھا، یہ خیال کہ کمرہ بالکل تیرہ وتار ہو بالکل غلط ہے یہ خیال کہ لڑکی کے پاس کوئی جا نہ سکے اس سے زیادہ غلط ہے۔ لونڈیاں ماما ئیں۔ برابر کی ہم عمر لڑکیاں۔ بہنیں۔ بھاوجیں۔ برابر آتی جاتی رہتی تھیں۔ البتہ مرد اور بڑی بوڑھیاں بہت احتیاط کرتی تھیں۔ ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ دُلہن کو مائیوں میں غور وخوض کا کافی موقعہ ملتا تھا۔ اور وہ طے کر لیتی تھی کہ اُس کو آیندہ کیا کرنا اور کس طرح زندگی بسر کرنی ہے۔

لڑکیوں کی تربیت

چند سال ہوئے تعلیم نسواں کے سلسلہ میں دورِ حاضرہ اور دورِ گزشتہ کی مسلم
خواتین کے متعلق بحث شروع ہوئی تھی۔ مگر جس طرح اور بہت سے مسائل کا حشر کاغذی گرما
گرمی ہوتا ہے اسی طرح یہ مسئلہ بھی کچھ دن اپنا زور و شور دکھا کر ختم ہوگیا۔ اب پھر کچھ روز سے
بالخصوص اسوقت سے جب سے کہ ایک زنانہ پرچہ نے لڑکیوں کے نصاب کا مسئلہ
پیش کیا ہے اسپر بحثیں ہو رہی ہیں۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جو مسلمان تعلیم نسواں کی
ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں، ان میں سے بیشتر اسی تعلیم کے موافق ہیں جو اسوقت کے
مدارس میں ہو رہی ہے۔ مگر زیادہ نہیں تو چند ایسے بھی ہیں جو میری طرح دورِ گذشتہ کی بیبیوں کو
اسلام کی کسوٹی پر دورِ حاضرہ کی تعلیم یافتہ خواتین کے مقابلہ میں زیادہ مفید بتائیں گے۔
میں پچھلے پرچہ میں نصاب مروجہ کی ایک جھلک دکھا چکا ہوں اور ان حضرات
سے جن کی زبان پر مرثیہ والی بیبیوں کا نصاب امقیا۔ کریما۔ وغیرہ تک محدود ہے۔ دریافت
کرچکا ہوں کہ یہ نصاب جس کی یہ تین ریچھوں کی کہانی موجود ہے۔ کس حد تک لڑکیوں کے
اخلاق پر اچھا اثر ڈالیگا۔ اس کا جواب میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔ البتہ میری نظر سے
ایک اور مضمون گذرا جسمیں یہ تعجب انگیز فقرہ درج تھا کہ پہلے زمانہ کی لڑکیاں لکھنے سے
قطعی محروم تھیں۔ ان کو لکھنا نہیں سکھایا جاتا تھا۔ اس مضمون میں منجملہ اور بہت سی
باتوں کے قابل مضمون نگار نے یہ بھی تحریر فرمایا تھا۔ کہ دورِ گذشتہ کی بیبیوں کی

عورت کا دِل مرد سے زیادہ نرم ہوتا ہے۔ وہ کسی کی تکلیف یا مصیبت سے مرد کی نسبت جلد متاثر ہو جاتی ہیں۔ آج سے بیس پچیس برس پہلے مسلمان عورتیں اپنے ہمسائے۔ دور پرے کے رشتہ وار یا گھر کی نوکرماماؤں سے جو سلوک کر رہی تھیں۔ اس وقت وہ چیز ہمارے ہاں اتنی نہیں رہی۔ آج وہ ہمدردی اور رحم کا مادہ مسلمان لڑکیوں میں گھٹ رہا ہے۔ یہ بات اس طرح اور آسانی سے سمجھ میں آجائیگی کہ محلہ کی مسجد میں جو ملاجی رہتے تھے۔ وہ زیادہ تر طالب علم ہوتے تھے۔ یا بڈھے مسجد کے خدمت گذار۔ اگر وہ طالب علم ہوتے تھے تو حضور اکرم کے ارشاد کے موافق اُن کی خدمت ایک اچھا کام تھا۔ اگر بڈھے ہیں اور مسجد کی خدمت کرتے تو بھی انکا حق ہم پر پیدا ہو گیا کہ وہ خانہ خدا کی خدمت کر رہے ہیں۔ اب محلہ کا کام یہ ہے کہ اُن کو کھانے پینے کے فکر سے چھٹکارہ دلوائے۔ چنانچہ ہر گھر سے ان کی خدمت ہوتی تھی اور گھر والی بیوی پہلے ان کا کھانا بھیج دیتی تھی۔ اور سمجھتی تھی کہ اس کا ثواب کسی عزیز کو پہونچے گا۔ مگر اب یہ اعتقاد ختم ہو چکے۔

مسلمان لڑکیاں اپنے کسی جوہر کو مٹاتے وقت اچھی طرح غور کر لیں کہ آپکی تہ میں کیا خوبیاں ہیں جو وہ کھو رہی ہیں۔

بنات ۱۹۳۴ء

کے ساتھ ان کے اپنے حافظ شاگردوں کی تعداد اس قدر کثیر تھی کہ عزیزوں کو کندھا دینے کی نوبت بمشکل میسر آئی۔ کیا میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ دورِ حاضرہ کی کسی تعلیم یافتہ خاتون کا جنازہ بھی اِس دھوم دھام سے ہندوستان کے کسی شہر میں اُٹھا ہے؟ اگر حفظ قرآن یا تعلیم حفظ قرآن معیار قابلیت قرار نہیں پا سکتا تو میں نے اِسی مضمون میں یہ بھی لکھا تھا کہ مرتے وقت تک ان کا آٹھویں دن کا وعظ جس میں دہلی کے بڑے بڑے گھرانوں بالخصوص پنجابیوں کی اکثر خواتین شریک ہوتی تھیں۔ ناغہ نہیں ہوا۔ آج کتنی انجمنیں، کس قدر سوسائٹیز ہندوستان میں ایسی موجود ہیں جن میں بلا ناغہ اور بلا معاوضہ کوئی تعلیم یافتہ خاتون اپنے لکچر یا سپیچ سے اِس قسم کا فائدہ پہنچا رہی ہے؟ اِن کا خط زیادہ اچھا تو نہ تھا مگر لکھنا جانتی تھیں۔ اور ان کے خط کو دیکھکر یہ کہنا کہ اگلے زمانہ کی عورتیں لکھنا نہیں جانتی تھیں درست نہیں رہتا۔

اب میں ایک دوسرا زندہ کیریکٹر شروع کرتا ہوں۔ یہ بیوی اِس وقت ارضِ حجاز میں ہیں۔ شمس العلماء مولوی نذیر احمد کی نواسی اور مولوی اشرف حسین صاحب مرحوم کی بیوی۔ ان کی پرورش اور تربیت کا زمانہ غدر ۱۸۵۷ء کے آٹھ دس سال کے بعد کا ہے۔ انہوں نے تعلیم بھی گھر پر پائی، اور ان کی تربیت بھی گھر میں ہوئی۔ ان کی تربیت کا سہرا میری بڑی پھوپی مولوی نذیر احمد صاحب کی بیوی مرحومہ صفیۃ النسا کے سر ہے۔ میں اِس وقت بھی دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر ہندوستان کی مکمل تعلیم یافتہ سو لڑکیاں منتخب کی جائیں تو ایک مسلمان عورت کی تمام حیثیتوں کا مجموعہ جس قدر ان کی ذات میں ہے دوسری اعلیٰ تعلیم یافتہ

کتابیں چونکہ یہی دو چار تھیں۔ اس لئے طب وغیرہ کا ان کو علم ہو نہیں سکتا تھا۔ اور وہ ان چند باتوں کے سوا جو ان کتابوں میں درج تہیں اور کچھ نہ جان سکتی تھیں۔

مجھے تعجب ہے کس طرح مسلمان ان خیالات سے متفق ہو سکتے ہیں۔ تعلیم علیحدہ چیز ہے اور تربیت علیحدہ۔ پہلے زمانہ میں تعلیم کتابوں کی ہوتی تھی۔ اور تربیت گھر کی بڑی بوڑھیاں کرتی تھیں۔ آج وہ چیز نہیں ہی۔ اور تربیت کی مسلمانوں کو ضرورت نہیں رہی۔ صحبت جو میسر آرہی ہے وہ ناقص ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسلام جو اصلی چیز تھی فنا ہو رہی ہے۔ اور اس کا ذمہ دار موجودہ نصاب ہے۔

مسلمانوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ نصاب مروجہ نے لڑکوں ہی کو سچے معنوں میں مسلمان نہ رکھا اور اس کا ثبوت بڑے بڑے شہروں کی وہ عالیشان مسجدیں ہیں، جن کے نیچے مغرب کی نماز کے وقت سینکڑوں تعلیم یافتہ مسلمان دنیاوی ضرورتوں میں مصروف نظر آتے ہیں!

اس تجربہ کے بعد اگر یہی تعلیم لڑکیوں کو بھی دی گئی تو جو تھوڑا بہت اسلام کا چرچا مسلمان گھروں میں صرف عورتوں کے دم سے موجود ہے وہ بھی ختم ہو گا۔

تعلیم نسواں کے سلسلہ میں مسلمانوں کا پہلا فرض ان کے نصاب میں مذہب داخل کرنا ہے تاکہ مسلمان بچیاں مدارس میں تعلیم پانے کے بعد بھی مسلمان رہیں۔ اور اگر اسلام کو کھو کر وہ فرشتہ بھی ہو گئیں تو مسلمانوں کے واسطے بے سود ہیں۔

فروری ۱۹۲۵ء کے عصمت میں میں نے حافظہ عطیۃ النساء مرحومہ مغفورہ کے حالات لکھے تھے۔ انہوں نے اسی برس کے قریب عمر پائی۔ ان کی تعلیم و تربیت غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اس کے کچھ بعد کی تھی۔ میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ انکے جنازے

معائنہ کر رہے تھے۔ فضل علی صاحب ڈپٹی کلکٹر کا کیمپ بھی وہیں تھا اور میں بھی وہیں۔ شام کے چار بجے تھے کہ فضل علی صاحب نے آکر کہا۔ "بیگم صاحب آج راجہ صاحب آگئے ہیں۔ رات کے کھانے کا انتظام آپ کر دیجئے۔ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں اور کھانے کے شوقین۔ دِلّی کا نام ہو جائے" رات کے دس بجے فضل علی صاحب معہ مہمانوں کے آگئے۔ کھانا چُنا گیا۔ راجہ صاحب نے بہت تعریف کی اور فرمایا "لکھنؤ میں اِس قدر جلد اتنا اچھا کھانا آسانی سے تیار نہیں ہو سکتا"۔

اِن کے مزاج کی سادگی کنبہ میں مشہور ہے۔ محلّہ کی اکثر حاجتمند عورتیں ان کے پاس اپنی ضرورتیں لیکر آتیں اور مشکل سے ناکام جاتیں۔ ان کی فراخ حوصلگی کا ایک واقعہ جو آجتک راز تھا اور میرے علم میں ہے بیان کرتا ہوں۔ ایک عزیز کی بیوی بیمار ہوئیں اور علاج میں اِس قدر روپیہ صرف ہو گیا کہ اُن کو قرض لینے کی ضرورت ہوئی۔ بیچارہ نے پچاس روپیہ ایک عزیز سے جو ابتک زندہ ہیں قرض مانگے مگر نہ ملے۔ بیگم صاحب کو بھی خبر ہوئی ان کو دیکھنے گئیں اور چلتے وقت نہایت خاموشی سے پچاس روپیہ کے نوٹ ان کی جیب میں ڈالدیئے۔ میں اس وقت وہاں موجود تھا۔ اور میں نے دیکھ لیا۔ لیکن حاجتمند کو پتہ نہ چلا۔ اُنھوں نے مجھ سے ذکر بھی کیا مگر میں خاموش رہا۔

شوہر کے ساتھ اُن کے تعلقات آجکل کے لوگوں کو کہانیاں معلوم ہوں گے مگر اسکے دیکھنے والے دو چار نہیں، کنبہ کا کنبہ موجود ہے۔ ان کو اپنے شوہر مولانا اشرف حسین مرحوم سے محبت نہیں عشق تھا۔ دو دو تین تین مامائیں دو دو تین تین نوکر لڑکے مگر مولانائے مرحوم کا حُقّہ اپنے ہاتھ سے بھرتی تھیں۔ جاڑوں میں کوٹھے پر اور گرمی میں دو منزلہ پر خود لیکر جاتی تھیں اور خوش ہوتی تھیں۔ جہیز میں معقول جائداد ملی تھی۔ مگر

عورت میں مشکل سے ہوگا۔ ان کا خط اگر سو سے بدتر ہوگا تو ہزار سے بہتر۔ وہ انگریزی نہیں جانتیں مگر بچوں کی پرورش اور تربیت کا ملکہ اِس قدر کافی ہے کہ شائد زیادہ سے زیادہ کسی طبی مدرسہ کی تعلیم یافتہ لڑکی کا بھی اِتنا ہی ہوگا۔ وہ بچوں کی بیماریوں اور اُنکی دواؤں اور دواؤں کی خاصیت سے باخبر ہیں۔ اُنہوں نے اپنے بچے معمولی شکایتوں میں کبھی حکیم کے ہاں نہیں بھیجے۔ ایک موقعہ پر ان کا اپنا بڑا بچہ شائد دو سال کا بیمار رہوا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ سانس کی شکایت ہوئی صبح کے وقت بعض کی رائے ہوئی کہ پسلی یعنی ام الصبیان کا اندیشہ ہے۔ حکیم شجاعت علیخاں جو اس وقت کے مشہور طبیب تھے بُلانا چاہیئے۔ مگر اُنہوں نے اِس سے اتفاق نہ کیا۔ خود بازار سے دوائیاں منگوائیں اور کاتفل کی دو پوٹلیاں بناکر ایک سینہ پر لٹکادی۔ دوسرے دن بچہ کی حالت میں آسمان زمین کا فرق تھا۔

سوئی کا کام کنبہ کی اکثر عورتیں اتنا ہی اور دو ایک اُن سے بہتر جانتی تھیں۔ مگر ایک دفعہ اُنہوں نے اپنے شوہر کے واسطے تکیہ کا غلاف اور کرتہ کاڑہا۔ مولانا اشرف حسین مرحوم اس وقت لکھنؤ میں انسپکٹر زراعت تھے۔ احباب نے غلاف بہت پسند کیا۔ اور صدر قانون گو صاحب جو لکھنؤ کے رہنے والے تھے کرتہ پر ایسے ریجھے کہ اس کا گریبان اور بوٹی دکھانے کے واسطے اپنے گھر لے گئے۔

کھانا پکانے کے واسطے ان کے پاس دو ماما ئیں تھیں اور جب شوہر کے ساتھ جاتی تھیں تو ایک باورچی بھی۔ مگر شوہر کا کھانا ہمیشہ وہ اپنے ہاتھ سے پکاتی تھیں۔ اور مختصر یہ ہے کہ کھانا پکتے وقت ان کا تمام وقت اسی میں صرف ہوتا تھا۔ اور بہت کم باورچی خانہ سے الگ ہوتی تھیں۔ مولانا مرحوم کانپور کی تحصیل اکبر پور کا

مصوّرِ غم

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) شاہجہاں آباد کے اُس مقتدر اور ممتاز خاندان کے فرزند رشید تھے جسے خاندان شاہان مغلیہ کے اُستاد ہونیکا نسلاً بعد نسلاً فخر حاصل رہا۔ جس نے مولوی عبد الخالق صاحب مرحوم مولوی عبد القادر صاحب مرحوم اور ہندوستان کے مشہور سحر البیان مولوی عبد الرب مغفور بانی جامع مسجد سہارنپور جیسے جید علمار اور قرآن وحدیث کے نامور ماہرین پیدا کئے۔ یہ اجڑے دیار کا وہ نامور خاندان تھا جس کی بیٹیاں حافظہ، حاجیہ، قاریہ ام عطیہ النسا مرحومہ (چھوٹی استانی جی) اور حاجیہ ام ذکیہ مرحومہ جیسی مشہور عالمہ فاضلہ خواتین اور جس کے داماد شمس العلمار مولوی نذیر حسین مرحوم "محدث دہلی" اور شمس العلمار مولوی نذیر احمد مرحوم جیسے نامور بزرگ تھے۔ حضرت علامہ مغفور بمقام دہلی جنوری ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے، اور ابھی نو دس برس ہی کے تھے کہ ان کے والد ماجد مولوی حافظ عبد الواحد صاحب نے حیدر آباد دکن میں جہاں وہ محکمۂ بندوبست میں افسر اعلیٰ تھے، انتقال فرمایا، اور حضرت علامہ مرحوم کی تعلیم وتربیت ان کے دادا اور چچا حضرت مولوی عبد القادر صاحب مرحوم اور خان بہادر مولوی عبد الحامد صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر کی نگرانی میں ہونے لگی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم کو مسلمان کفر سمجھ رہے تھے۔ اس لئے حضرت علامہ مغفور نے اُردو فارسی عربی وغیرہ گھر پر پڑھی۔ پھر انگریزی تعلیم دہلی کے عربک اسکول میں ہوئی۔ مگر انہوں نے اپنے شوق سے اسے بہت کچھ ترقی دی۔ مولوی نذیر احمد مرحوم (جو علامہ مرحوم کے حقیقی پھوپا تھے) اور مولانا حالی مرحوم کی شاگردی نے علامہ مغفور کی قابلیت کی ترقی میں چار چاند لگادیئے۔ ابھی حضرت علامہ انٹرنس ہی میں تھے کہ ان کی ذہانت کا چرچا ہونے لگا۔

تکمیل تعلیم کے بعد مولوی عبد الرحیم صاحب بانی جامع مسجد جھجر کی اکلوتی صاحبزادی سے جنوری ۱۸۹۰ء میں شادی ہوئی۔ اور ۱۸۹۱ء میں محکمۂ بندوبست کے انگریزی دفتر میں ملازمت شروع کی۔ مگر ملازمت کی پابندی حضرت علامہ کی طبیعت

ہمیشہ ساس نندوں کے ساتھ زندگی بسر کی۔

اِن کا سب سے بڑا نصاب گھر کی تربیت اور بزرگوں کا فیض صحبت تھا گھر میں ہر وقت قرآن و حدیث کا چرچا تھا۔ آٹھویں دسویں روز وعظ۔ مہینے دوسرے مہینے مولوی نذیر حسین صاحب محدث کی باتیں۔ یہ ہی تھیں۔ وہ چیزیں جنہوں نے ان کو مسلمان عورت بنایا۔

شوہر کے بعد اُن کا دل دُنیا سے بیزار ہو گیا۔ بیٹے بیٹیاں نواسے نواسیاں۔ پوتے پوتیاں۔ غرض بھرا گھر موجود ہو لیکن آنکھ کا آنسو نہیں تھمتا۔ ایک روز خواب میں دیکھا کہ شوہر کے ساتھ حج کر رہی ہوں۔ اُسی سال حج کو تشریف لے گئیں۔ واپس آئیں مگر یہاں دل نہ لگا مشکل سے دو سال کاٹے۔ ہر وقت مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تسبیح تھی۔ اس سال پھر گئی ہیں اور یہ فرما گئی ہیں کہ انشاء اللہ سال ڈیڑھ سال وہاں رہ کر دوسرے حج کے بعد واپس ہونگی۔

میرا مقصد اس تحریر سے یہ نہیں ہو کہ اگلے زمانہ کی تمام عورتیں قابل ستائش تھیں اور آج کی (خدانخواستہ) لائق ملامت۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ نصف صدی پیشتر کی بیشتر مُسلمان عورتوں میں جو اسلامی شان پائی جاتی تھی وہ آج کی اکثر لڑکیوں میں نہیں ہی۔ یہ میں نہیں کہتا کہ مکان یا کوٹھیاں۔ میز و کرسی سے مزین نہ ہوں۔ مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ اسکے ساتھ ہی اگر گول کمرہ میں نہیں تو کسی کوٹھری ہی میں جانماز بھی بچھی ہوئی نظر آجائے۔ بیوی اگر ایک طرف گھر کی ملکہ ہو تو دوسری طرف حقیقی معنوں میں شوہر کے دُکھ سُکھ کی شریک۔ خدا کا شکر ہے مُسلمان لڑکیوں کی تعلیم پر متوجہ ہوتے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اب ان کا فرض یہ ہے کہ نصاب میں مذہب کو مقدم سمجھیں اور تربیت کو تعلیم سے کم ضروری نہ خیال کریں۔

عصمت ۱۹۲۶ء

فخرِ نسوانِ ہند محترمہ خاتونِ اکرم جنّت مکانی کی یادگار میں

جوہرِ نسواں دہلی

زنانہ دستکاری کا ماہوار رسالہ ۱۹۳۴ء سے جاری ہے

دفتر عصمت دہلی کے اس ماہوار رسالہ میں کشیدہ۔ کروشیا۔ جالی۔ تارکشی۔ کارپٹ۔ کینوس۔ کراس اسٹیچ۔ سلمہ ستارہ۔ رِبن ٹِپّی۔ گوٹا اور کپڑوں کی سلائی۔ کٹائی وغیرہ وغیرہ مختلف قسم کی زنانہ دستکاریوں کے عمدہ عمدہ نمونے اور مفصل ترکیبیں اور کار آمد ہدایتیں شائع ہوتی ہیں جوہرِ نسواں کے مضامین پھوہڑ لڑکیوں کو بھی سگھڑ اور ہنرمند بنا دیتے ہیں جوہرِ نسواں کی قلمی معاونین ہندوستان کی مشہور دستکار خواتین ہیں اور اڈیٹر مقبول و مشہور کتابوں کی مؤلفات۔ سال میں دو خاص نمبر شائع ہوتے ہیں جو کسی موضوع پر بہترین مستقل کتابیں ہوتی ہیں۔

ٹائیٹل نہایت خوبصورت کاغذ چکنا دبیز لکھائی چھپائی مصوری اعلیٰ درجہ کی۔

سالانہ چندہ۔ مع محصول دو روپے آٹھ آنے۔ فی پرچہ ۴ر

دفترِ عصمت کی کچھ اور کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
سوئی کا کام	عۂر	ادب زریں	۸ر	افسانہ حرم عہ، فیروزہ	۸ر
موتیوں کا کام	عہ؍	نغمات موت	۶ر	آئینہ موثر	عۂر
سلمہ ستارہ کا کام	عاؔر	خانہ داری کے تجربات	۱۲ر	سنگھار خانہ	عاؔر
اونی کام سلائیوں سے	عۂر	مفید نسواں	۸ر	تندرستی ہزار نعمت	۵ر
خواتین کی دستکاریاں	۸ر	جاں باز	۱۲ر	زنانہ بستہ عہ، شمع خاموش	۶ر
جاپانی کہانیاں	عہر	دامن باغباں	عہر	پردہ و تعلیم	۱۲ر
مزیدار کہانیاں	۵ر	روحانی شادی	۶ر	صنعت و حرفت	عاؔر
شہید وفا	عہ	آئینہ جمال	۱۲ر	زچہ خانہ	سہ

علاوہ مذہب کے فارسی شاعروں اور انگریزی مصنفین کا بھی مطالعہ فرمایا تھا، حافظہ حیرت انگیز تھا۔ موسیقی سے بہت دلچسپی تھی، انگریزی اور ہندوستانی بہت سے کھیل جانتے تھے۔ بدن کسرتی تھا، جسم دوہرا قد لمبا، چہرہ پر دلالت اور نور برستا تھا۔ خانگی زندگی انتہائی کامیاب تھی اور دیکھنے والوں کے لئے ہر حیثیت سے قابل رشک تھی۔ بے نظیر بیٹے، لاجواب بھائی، سعادتمند داماد۔ بےمثل شوہر، عاشق زار باپ، اور بہترین دوست ہمیشہ شاداں و خنداں رہتے تھے۔ ان کی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور زندہ دلی ان کے ملنے والے بھلائے سے بھی نہیں بھول سکتے۔ جن کی قابلیت کا چار کھونٹ ڈنکا بج رہا تھا۔ جن کی شہرت اس دور کے بڑے بڑے مصنفوں اور رہنماؤں کیلئے باعث رشک تھی، جن کا نام عزت کے ساتھ جنکا ذکر محبت کے ساتھ لیا جاتا، اور کیا جاتا تھا، ان کی شرافت اور اخلاق، سادگی اور وضعداری، مہمان نوازی اور انسانی ہمدردی دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈالدیتی تھی۔ ان کی عاجزی اور انکساری کا یہی ثبوت کچھ معمولی نہیں کہ ۶۰ کے قریب کتابیں زندگی میں شائع ہوگئیں لیکن کسی کتاب میں تصویر شائع نہ کرنے دی۔ کسی کتاب کو کسی کے نام منسوب نہ کیا۔ کسی کتاب میں کسی کی تقریظ جائز نہ سمجھی۔ تین چار کتابوں میں دیباچے بھی مجبوراً لکھے ورنہ سوائے "ٹائیٹل پر نام آنے کے اپنا نام تک اپنی کتاب میں دوبارہ آنا پسند نہ فرمایا۔ صبر شکر توکل و قناعت ہمیشہ شیوہ رہا۔ اپنی حالت میں بے انتہا خوش رہے۔ رحمدلی مخلصانہ عملی ہمدردی، غیروں کی آگ میں کود پڑنا، دوسروں کے لئے سب کچھ لٹا دینا المختصر خدمت خلق اللہ حاصل عمر تھا۔ ۶۸ سال کی عمر تھی، اور بظاہر صحت نہایت اچھی کہ دو ماہ بیمار رہ کر ۳ فروری کی منحوس صبح کو اجڑے دیار کے آخری باکمال مصنف کا سایہ قوم بدبخت کے سر سے اُٹھ گیا۔ مصورِ غم کی رحلت پر ہندوستان بھر کے ہر پڑھے لکھے گھرانے میں کہرام مچ گیا۔ جگہ جگہ زنانہ اور مردانہ ماتمی جلسے ہوئے اور ہندوستان کے باہر ادب اردو کا ذوق رکھنے والا ہر شخص دم بخود ہوگیا۔ جس قدر رنج و غم میں ڈوبے ہوئے مضامین جتنے مرثیے نوحے قطعات تاریخ المختصر جس قدر بلند پایہ ماتمی لٹریچر مصورِ غم کے انتقال پر شائع ہوگیا وہ اتنا زبردست ہے کہ بقول اڈیٹر ملت "کسی ادیب یا رہنما کی وفات پر اسوقت تک شائع نہ ہوسکا" آسمان کتنی ہی کروٹیں بدلے، زمین کتنے ہی چکر کاٹے، ہندوستان بدلے، ہندوستان والے بدلیں، معاشرت بدلے، ادب بدلے لیکن مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری کو ہمیشہ عزت و محبت کیساتھ یاد کیا جائیگا اور انکا نام آنیوالی نسلیں فخر کیساتھ لیتی رہیں گی۔ خدا کی بیشمار رحمتوں کے پھول اس مزار مبارک پر برستے رہیں جہاں وہ میٹھی نیند سوئے ہیں اور خدا جنت نعیم میں اس پاک روح کو ابدی سکون عطا فرمائے جسکی دائمی مفارقت میں آٹھ آٹھ آنسو رلا رہی ہے۔

۲۲ جولائی ۱۹۳۶ء

رازق الخیری